دلّی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب

دلّی کی کہانی

کچھ میری

کچھ میر

غالب

اور

داغ کی زبانی

جامع مسجد کی کہانی

اہل وطن کی زبانی

۱۸۵۷ء

کا

المیہ

کی آزمائش ہے

کی آزمائش ہے

مولانا عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی ثم دہلوی

۵۲۹۶ — کوچہ رحمٰن — چاندنی چوک، دلّی

بدلِ اشتراک :- ۔/۴ روپے

"دلّی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب"

دلّی کی کہانی

۱۸۵۷ء

اور

غالبؔ

قدِ و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

از

مولانا عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی

۵۲۹۶ - کوچہ رحمٰن - چاندنی چوک

دہلی - 110006

کچھ میری

کچھ میرؔ

غالبؔ

اور

داغؔ کی - زبانی

جامع مسجد کی کہانی

اہلِ وطن کی زبانی

"دلی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب"

تفصیل اشاعت

دلّی کی کہانی

تصنیف و تالیف ——— عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی

بار اوّل ——— پانچسو (۵۰۰)

طباعت ——— اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلی ماران - دہلی

مقام اشاعت ——— ۵۲۹۶ - کوچہ رحمٰن - گلی شملہ والی
چاندنی چوک - دہلی ۶

قیمت ——— چار روپے (-/4)

تاریخ اشاعت ——— مئی ۱۹۷۵ء

عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی نے اعلیٰ پرنٹنگ پریس بلیماران دہلی سے طبع کرا کے ۵۲۹۶ کوچہ رحمٰن۔ گلی شملہ والی۔ چاندنی چوک دہلی ۶ سے شائع کیا۔

تصاویر:- فوٹو آفسیٹ پرنٹرز۔ گلی چھرّے والی۔ بارہ دری شیر افگن۔ بلیماران۔
دہلی ۱۱۰۰۰۶

ٹائیٹل:- تاج پرنٹنگ پریس۔ بلّی ماران۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

ملنے کا پتہ (۱) عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی ۵۲۹۶ کوچہ رحمٰن چاندنی چوک دہلی ۶ ۱۱۰۰۰۶
(۲) الجمعیۃ بکڈپو۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے حاصل کیجئے

کتبہ۔ اظہر بجنوری ۱۹۷۵ء

انتساب

- محترم سیّد عبداللہ بخاری ۔ شاہی امام جامع مسجد ۔ دہلی

کے بعد

- ان شہیدوں کے نام جن کا خون ۲ر فروری ۱۹۷۵ء کو جامع مسجد اور علاقہ جامع مسجد میں بہایا گیا۔
- فریدہ کے نام جس پر گھر کے دروازے توڑ کر گولی چلائی گئی۔
- ان خاندانوں کے نام جن کے بچے جوانی میں شہید کردیئے گئے۔
- تمام شہریوں کے نام جن پر چھیانوے گھنٹہ تک کھانا پینا بند رکھا گیا۔
- معصوم بچے، بیمار، جو دودھ اور دوا کے بغیر تڑپتے رہے۔
- معصوم بچی طاہرہ کے نام جو چھت سے گر کر گھر ہی میں جان دے گئی۔
- ان ممبران پارلیمنٹ کے نام جنہوں نے پارلیمنٹ میں حق گوئی کا ریکارڈ قائم کیا۔
- ان تمام لوگوں کے نام جن کی جد و جہد سے دِلّی میں ہندو مسلم فساد نہ ہو سکا۔
- ان اردو اور انگریزی اخبارات کے نام جنہوں نے جامع مسجد کے واقعات اور حادثات کی صحیح رپورٹ شائع کر کے مسلمانوں کی اور جمہوریت کی مدد کی۔
- اپنی بہن خاتون جنّت اور رفیقۂ حیات، کلثوم خانم کے نام جنہوں نے ۱۹۴۷ء میں لدھیانہ چھوڑا۔ اور اب تک نامساعد ماحول میں زندگی بسر کر رہی ہیں —— غربت اِن کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا۔

۲ر فروری ۷۵ء کو جب جامع مسجد دہلی پر گولیاں برس رہی تھیں اور خون بہہ رہا تھا۔

تو —— میرا گھر —— ماتم کدہ بنا ہوا تھا

عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی ثم دہلوی

۱۵ر مارچ ۷۵ء

انتساب دوم

پارلیمنٹ کے اسپیکر سردار ڈھلون کے نام

جنہوں نے یہ کہکر

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو (انیس)

جامع مسجد کے حادثات پر چار گھنٹہ کے لئے بحث کے لئے وقت دیا

انتساب سوم

پیلو مودی کے

نام

جنہوں نے ثابت کر دیا

کہ

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی !
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی (اقبال)

انتساب چہارم

عزیزم انور ــــــــ عزیزہ زبیدہ

اور بچوں کے نام

جن کے پیار بھرے خطوط سے متاثر ہو کر

دِلّی

کی تاریخ ضبطِ تحریر میں آگئی

عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی

۱۲ مارچ ۷۵ء



سردار ڈھلّن اسپیکر لوک سبھا

(جامع مسجد کے واقعات پر)

آپ نے یہ کہہ کر پارلیمنٹ میں بحث کی اجازت دی

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

(انیسؔ)

فریدہ کا خط

میں ۲ فروری ۷۵ء بروز اتوار اپنے گھر، مکان نمبر 689 بازار چتلی قبر کی دوسری منزل پر اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ ہمارا یہ مکان جامع مسجد دہلی سے تقریباً ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلہ پر واقع ہے ظہر کی نماز سے پہلے جامع مسجد کی طرف سے آنسو گیس کے گولوں اور بندوقوں کے چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم ڈر کر گھر کے اندر پردہ ڈال کر بیٹھ گئے تھے لوگوں کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھیں اچانک نیچے سے دروازہ ٹوٹنے کی اور نیچے والے گھر میں گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر زینہ پر آدمیوں کے چڑھنے اور بولنے کی آواز آئی کہ "بوڑھے یا جوان جو بھی ملیں گولی مار دو" یہ کہتے ہوئے وہ لوگ اوپر آ گئے۔ یہاں سے بھی کئی فائر کئے اس کے بعد کمرہ کا پردہ پھاڑ کر اندر آ گئے یہ سب باوردی پولیس والے تھے اور تعداد میں چار تھے انہوں نے کہا "اپنے آدمیوں کو نکال کہاں ہیں؟" جب ان کو کوئی آدمی نظر نہ آیا تو کمرے کا سامان توڑنے پھوڑنے لگے اور گالیاں دینے لگے۔ الماری سے سامان نکال لیا۔ اور سلائی مشین توڑ دی۔ ایک ٹائم پیس اور ایک کالے رنگ کا بٹوہ جس میں 337 روپے تھے نکال لیا۔ انھیں میں سے ایک پولیس والے نے میری طرف بندوق کر کے آنگن میں سے مجھ پر فائر کر دیا۔ گولی لگنے سے میں فوراً بے ہوش ہو گئی اس کے بعد کیا ہوا مجھے خبر نہیں مجھے جب ہوش آیا تو میں ہسپتال میں تھی۔ بعد میں مجھ کو معلوم ہوا کہ مجھے گولی لگنے کے صدمہ سے میرے والد محترم انتقال فرما گئے۔

فریدہ شجاع الدین

دہلی ۲۴ فروری ۱۹۷۵ء

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

(اقبال)

حرف وحکایت ـــــــــ!

ہزاروں سال سے دلی کی "نانی اماں" صدی بہ صدی سال بہ سال ماہ بہ ماہ اور ہر شب یہی کہانی سناتی چلی آئی ہے۔ یہ روایت بیشک ہم تک سینہ بہ سینہ ہی پہنچی ہے لیکن حقائق کی ترجمان ہے۔ کہ دلی کو راجہ دِہلو نے بڑے ہی خلوص سے آباد کیا تھا۔ اور بڑے ہی خلوص سے اس کا نام رکھا تھا۔ واقعی قدرت کو راجہ دِہلو کا خلوص پسند آگیا۔ راجہ دِہلو کی دِلی کا حدودِ اربعہ کیا رہا ہوگا اس کے متعلق تو کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ راجہ دِہلو کا خلوص قدرت کو پسند آیا۔ اس طرح دِلی کے دل چاندنی چوک سے تیس تیس میل مغرب و مشرق، شمال و جنوب میں دِلی کے حدودِ اربعہ کی نشانیاں موجود ہیں۔ آج اسی حدودِ اربعہ میں دِلی کی فلک بوس عمارتیں، دہلی میں آنے والے سیاحوں کے دل جیت لیتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی آئے تو دِلی کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ کبھی وہ دِلی تھی جس کو انگریزوں نے مٹایا تھا۔ یا یہ دِلی ہے کہ ہر قدم پر زندگی کی تابناکیاں سیّاحوں کے لئے کشش کا باعث ہے۔

دِلی میں بہت سی سلطنتیں آئیں اور اپنا دَور ختم کر کے ہمیشہ کے لئے مٹ گئیں۔ ان سلطنتوں نے اپنے عروج کے زمانے میں "اِندر پرستھا"۔ "رائے سینا"۔ "تغلق آباد" "لودھی پور"۔ "شاہجہاں آباد" ۔ اور دوسری راجدھانیاں بنائیں۔ اپنی دانست میں دِلی کو مٹا کر نیا نام رکھا گیا۔ لیکن ناموں کا یہ سکّہ دلی کے سامنے نہ چل سکا۔

راجہ دِہلو کا خلوص ان سب پر غالب آگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی مقدس گھڑی تھی جس وقت دہلی نے "دُہلی" کا نام پایا۔ "دُہلی" کا یا عظمت نام ہزاروں سال یونہی چلتا رہا۔ اس اندازے سے معلوم ہوتا ہے کہ دِلی کے اطراف میں بھی کھڑی بولی یا پراکرت بھاشا بولی جاتی تھی۔

بقول مولانا آزاد مرحوم ہندوستان میں علم و ہنر اور حُسن کا طوفان لے کر آئے اور

آن کی آن میں سارے ہندوستان پر چھا گئے۔ مسلمان علمار کی محفل میں فارسی کی شیریں بیانی نے "دُوہلی" کا ثقیل لفظ قبول نہ کیا۔ جس طرح بچپن سے عنفوان شباب اور عنفوان شباب سے جوانی میں انسان قدم رکھتا ہے۔ بجنسہٖ دہلی کا لفظ بھی تین ادوار میں ترقی کرکے دِتی بن گیا۔ کھڑی بولی میں "دوہلی" تھا۔ فارسی نے بڑے پیار سے اِس "دُوھلی" کی واؤ اور پیش کو حذف کرکے دال کے نیچے زیر لگادی۔ اس طرح دُوھلی ترقی کرکے دِہلی بن گیا۔ جب فارسی اور ہندی کے پیٹ سے اُردو نے جنم لیا۔ اور قلعہ معلیٰ سے کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی "اردو" عالموں اور شاعروں کی زبان پر رقص کرنے لگی۔ تو حُسن وعشق کی داستانیں مرتب کرنے کے لئے اشاروں اور کنایوں میں کہی جانے والی باتوں میں دہلی کا لفظ شاعروں کو پسند خاطر نہ ہوا اور لفظ دہلی شاعری میں کھپ نہ سکا۔ اس لئے شعری رعایت کے لئے ضروری تھا کہ دھلی کو دتی میں تبدیل کیا جائے۔ ریختہ کے استادوں نے اس پہیلی کی اس طرح لفظ دہلی شعروشاعری میں "دِتی" بن کر چمکنے اور دمکنے لگا۔ ریختہ کے استادوں میں میرتقی میر پہلا شخص ہے۔ جس نے دِتی کو قافیہ، ردیف میں استعمال کیا ہے۔

اپنے وطن سے تو دنیا کو محبت ہوتی ہے۔ لیکن دِتی میں جو آیا دِتی کے حسین وجمیل ماحول میں اس طرح کھو گیا کہ چند برسوں بعد اس کو یہ ہوش ہی نہ رہا۔ کہ اس کا ورودِ مسعود کہاں ہوا تھا۔ گویا دِتی کی آغوشِ راحت کوش میں اس کو زندگی کا جو لطف آیا اور دِتی میں اس نے جو دادِ عیش دی وہ اسے کہیں اور میسر نہ تھی۔ لاکھوں کی تعداد میں حسین لوگ دِتی آئے۔ سینکڑوں کی تعداد میں اولیار اللہ اور صوفیار کرام نے دِتی کو اپنا مسکن بنایا۔ دِتی کے باہر سے آئے ہوئے لاکھوں ہنرمندوں نے دِلی کی نوک پلک درست کی۔ یہاں ہاتھی دانت کے وہ نادرِ روزگار نمونے تراشے اور خراشے گئے جنہیں دنیا کے بادشاہوں اور امرار نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ سنہری اور روپہلی زیورات نے نسوانی حسن وشباب کو معراج تک پہنچا دیا۔ دنیا کی بہترین کاریگری کا نمونہ تخت طاؤس تھا۔ جو چاندی سونے اور ہیرے جواہرات سے بنایا گیا تھا جس کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہوجاتی تھیں۔ تخت طاؤس نادرشاہ ایرانی اپنے ساتھ لے گیا۔ دِلی کا مفلوج بادشاہ رنگیلا تخت طاؤس کی حفاظت نہ کرسکا۔ اس طرح شاہجہاں

دلّی کی عظمت و تقدس کا نہ پوچھیئے جو دلّی میں آیا دلّی کی عمارتیں دیکھ کر دنگ رہ گیا دلّی سے وہ اپنے ساتھ ایسی محبت لے کر گیا جس محبت کو وہ ساری عمر ایک کسک اور کھٹک کی طرح سے محسوس کرتا رہا۔ دید و باز دید کی تمنا دلوں میں مچلتی رہی۔ دلوں کی گہرائیوں میں دلّی کی عظمت و محبت کا تاج محل خوشبو دیتا رہا۔ "ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ"

اقبال جب قرطبہ اور غرناطہ میں گئے تو وہاں کی عظیم الشان عماتوں سے متاثر ہونے کے باوجود وہ دلّی کو نہ بھول سکے۔

سوادِ رومتہ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے
وہی عظمت، وہی ہیبت، وہی شانِ دلآویزی

دلّی کے کوچہ و بازار میں جب یہ اعلان کیا جاتا تھا کہ خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا، تو اس وقت امراء دکن، دلّی کے عالموں اور شاعروں کا بڑے جوش و مسرت سے خیر مقدم کر رہے تھے۔ جب یہ بات ذوق تک پہنچی تو ذوق نے اس خبر کو سن کر برملا جواب دیا۔

ع "کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر"

دلّی سے ذوق کے لگاؤ کی بات سن کر جو قدم دکن کی طرف بڑھ رہے تھے وہ رک گئے۔ امیر مینائی نے دلّی کے گلی کوچوں کو "اوراقِ مصور" سے تشبیہ دی۔ تو میر تقی میر نے دلّی کی عظمت و تقدس کا اس طرح اقرار کیا۔

دونوں ہاتھوں سے تھامیئے دل کو
میر صاحب یہ شہر "دلّی" ہے

۱۸۵۷ء کے المیہ کے بعد بہادر شاہ ظفر رنگون میں نظر بند کئے گئے۔ ظفر کو دلّی کا غم گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ دلّی بہادر شاہ ظفر کو محبوب تھی۔ وہ دلّی کی زمین کے لئے ساری زندگی روتے رہے۔ آخری وقت میں بڑے ہی درد انگیز پیرائے میں ظفر نے دلّی کو یاد کیا۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

اسی کوئے یار کا مرثیہ پڑھتے پڑھتے غالب بھی اس دنیا سے چل دیئے۔ یہ دلّی

انگریزوں کو بھی بڑی پسند آئی۔ یہاں انھوں نے بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں۔ راشٹرپتی بھون اور پارلیمنٹ کی عمارتیں انگریز کے حُسنِ تعمیر کی داد دینے کے لئے موجود ہیں۔ نئی دلّی کی بے شمار بڑی بڑی عمارتوں کے باوجود انگریز اردو زبان کی چاشنی سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ اور زبان کی حسین بندشوں سے ناواقف ہی رہا۔ زبان کا حُسن بیان کیا ہے انگریزوں کی واقفیت اس بارے میں صفر کے برابر ہے۔ دلّی کا لفظ جو سینکڑوں برس کی مسافت طے کر کے دِلّی بنا تھا اسے یک قلم انگریز کی دفتری زبان نے ڈلہی (DELHI) بنا دیا۔ انگریز کی اس بدذوقی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ غلامی کے گہرے اثرات کے باوجود دلّی والوں نے صاحب کے لفظ (DELHI) کو کبھی تسلیم نہ کیا۔ دِلّی اپنی جگہ دِلّی ہی رہی۔

دِلّی کی "داستان" جو آپ آئندہ صفحات میں پڑھیں گے، میں نے اپنی بھانجی پروین کے لئے لکھی ہے۔ پروین کی عمر کوئی دس سال کی ہے اور مدت سے وہ برطانوی شہری ہے۔ گذشتہ سال ۲۴ نومبر کو پروین اپنے والدین کے ساتھ مجھ سے ملنے دلّی آئی تھی۔ اس نے دلّی کے مختلف مقامات دیکھے اسے اصرار تھا کہ میں اس کے لئے دِلّی کی کہانی لکھ دوں۔ کیونکہ برطانیہ میں اس کے ہم کلاس بچّے اس سے دلّی کی کہانیاں سننے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ پروین کا کہنا ہے کہ میں ان بچوں کی باتیں سن کر بڑی شرمندہ ہوتی ہوں۔ مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں۔ کہ دلّی کا بچپن کیا تھا۔ دِلّی کون کون سے مراحل طے کر کے جوان ہوئی اور اپنے حسن وجمال کی شوخیوں سے محبوبِ عالم بن گئی۔ یہاں کون کون آیا۔ یہاں آکر کس کس نے ڈیرے ڈال دیئے۔ اور کون کون بغض وحسد اور رقابت میں دلّی کو لوٹ کر چلتا بنا۔ دِلّی غلام کیسے ہوئی۔ پھر اسے کس طرح آزادی مل گئی۔ آزادی کے بعد دِلّی کا چہرہ مغموم اور زرد کیوں ہو گیا۔ یہ ملک قرضدار کیوں ہے۔ یہاں کے حکمراں کیسے ہیں۔ لوگوں کو معاشی اور اقتصادی خوشحالی کیوں نہیں۔ سماجی انصاف یہاں کیوں نہیں۔ یہاں لوگوں کے چہروں پر خوشی اور مسرت کیوں نہیں ہے ؟

برطانیہ میں سنتی ہوں کہ ہندوستان کئی کھرب کا قرضدار ہے۔ کیا یہ سچ ہے کہ ہندوستان ۱۸۰ ارب کا سالانہ سود ادا کرتا ہے۔

اس کتابچہ کے پہلے حصہ میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے۔ وہ پروین کے سوالات کا بڑی حد تک جواب ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ پروین اسے پڑھ کر خوش ہوگی اور قارئین کے لئے دِلی کی اس تاریخ میں ہزاروں عبرتیں موجود ہیں۔ فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَار۔

اس خط کا دوسرا حصہ میں نے اپنی بہن عزیزہ زبیدہ اور عزیزم محمد انور کے خط اور ٹیلیفون کے جواب میں لکھا ہے۔ انھوں نے ٹیلیفون اور خط میں یہ اظہار خیال کیا:

"کہ دِلّی کے فسادات کے برطانیہ میں بڑے چرچے ہیں۔ رائٹر اور بی بی سی کے ٹیلی ویژن پروگرام۔ دل ہلا دینے والی تصویریں اور پروگرام نشر کر رہے ہیں۔ ہم لوگ جب دِلّی آئے تھے تو دِلّی میں بڑا سکون تھا محسوس ہوتا تھا کہ دِلّی کیا ہے جنتِ ارضی ہے۔ اب یہاں کی ٹیلی ویژن رپورٹیں اور اخبارات بتا رہے ہیں کہ دِلّی آگ و خون میں کھیل رہی ہے۔ آخر حقیقت کیا ہے۔"

دوسرے حصے میں ۲ر فروری ۱۹۷۵ء سے ۱۴ر فروری ۱۹۷۵ء تک کے واقعات عزیزہ زبیدہ اور عزیزم محمد انور سے زیادہ دِلّی اور ہندوستان کے لوگوں کے لئے مرتب کئے ہیں۔ تاریخ اگر واقعات کے ساتھ ہی ساتھ مرتب ہوتی رہے تو یہ ایک بہت ہی اچھی بات ہے۔ کیونکہ بعد میں مورّخ جھوٹی داستانیں مرتب کر کے تاریخ کے طالب علم کو گمراہ کرتا ہے۔ ہندوستان لادینی جمہوریہ ہے۔ اس سیکولر جمہوریہ کی عزّت و بقا ہم سب کا فرض ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جامع مسجد کے واقعات نے ہندوستان کی جمہوری رُوح کو بیدار کیا۔ ہندو سکھ عیسائی پارسی مسلمان عوام و لیڈر ڈٹ کر حکومت کے مقابلہ میں آگئے۔ پارلیمنٹ میں ممبرانِ پارلیمنٹ نے حقائق سے لبریز ایسی تقریریں کیں جس کا جواب دِلّی کی حکومت اور حکومت ہند کے پاس نہ تھا

یہ ناانصافی ہوگی کہ ہم ہندوستان کے سب سے بڑے جمہوری ادارے کے اسپیکر سردار ڈھلون کا شکریہ ادا نہ کریں نا سپاسی ہوگی۔ انھوں نے جامع مسجد کے واقعات پر بحث کرنے کے لئے چار گھنٹے بحث کا وقت دے کر اپنے عہدے کی عظمت کو چار چاند لگا کر

اس عہدہ کی عزّت کو محفوظ رکھا۔ ان کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے کہ خدا اِن کی عمر دراز کرے۔ پارلیمنٹ کی کرسئ صدارت ہمیشہ اِن کے پاس رہے۔

اس واقعہ پر ہندو مسلم اتحاد اور ...... رواداری، کمیونسٹوں کی دونوں جماعتوں کی حق گوئی، راج نارائن کی بے باکی، پیلو مودی کی حق بیانی، حکومت ہند پر سلیمان سیٹھ کی گرفت، ...... دہلی کے گورنر کا تعاون جمعیۃ العلماء ہند اور اخبار الجمعیۃ میں ناز انصا کا ... میں فکر انگیز تبصرہ۔ جماعت اسلامی اور دعوت اخبار کی واقعاتی رپورٹنگ۔ اور امام سیّد عبداللہ صاحب کی رہنمائی قابل تعریف ہے۔ کانگریسی ممبران پارلیمنٹ نے بھی ایک مخصوص انداز میں پارلیمنٹ میں اور پارلیمنٹ کے باہر تقریریں کی ہیں۔ ان کی تقریریں بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ دہلی کے ایل۔جی جناب کرشن چند صاحب نے اپنے بیان م منصفانہ بات کہی۔ کہ امام عبداللہ کی بات کتنی ہی غلط سہی لیکن وقف بورڈ کی کمیٹی کو ان کی بات سننی چاہیئے تھی۔ ایل۔جی نے شب و روز ایک کرکے آخر کار دلّی میں امام صاحب کے تعاون سے امن قائم کردیا۔ اس کے لئے گورنر صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے

اس تمام پس منظر میں رہنما شخصیت شاہی امام سیّد عبداللہ بخاری کی ہے۔ جنہوں نے ایک دفعہ دلّی کے عوام اور دلّی کی مختلف جماعتوں کے لیڈروں کو ایک مرکز پر جمع کردیا علاقہ جامع مسجد کے مسلمان عوام کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ انھوں نے تحمل اور بردباری سے کام لیا۔ سب کچھ برداشت کیا اور اُف تک نہ کی۔ یہاں تک کہ گولیوں سے ان کے سینے چھلنی ہوگئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عوام نے پولیس پر پتھر مارے تھے لیکن ان پتھروں کی سزا، جرم سے ہزاروں گنہ زیادہ دی گئی۔ ایسا نہ ہونا چاہیئے تھا۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشۂ لب بام ابھی

یہ ایک خط بھی ہے اور کہانی بھی، میں نے خط میں ایک کہانی لکھی ہے اور کہانی میں خط کے احساسات بھی موجود ہیں۔ انسان پر کچھ احوالات ایسے بھی گذرتے ہیں۔ کہ وہ ا

حالات کو خط اور کہانی میں کہہ گذرنا ہے۔ خط میں بعض جگہ سماجی اور دینی اشارے بھی آ گئے ہیں۔ یہ کہانی ادب و سیاست، سماجی اقدار اور دینی رُوح کے بغیر ادھوری رہ جاتی اور بے مزہ بھی ہو جاتی۔ بلکہ ایسی خشک تحریر ہوتی کہ پڑھنے والے کو لطف نہ آتا۔ کہانی تاریخ کے رموز نکات کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ پڑھنے والے کو اپنے ہی گھر کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اِس کہانی اور خط کی ایک ذاتی حیثیت بھی ہے۔ اس لئے بعض باتیں بلا ارادہ ہی تحریر میں آ گئیں۔ اچھا ہے قارئین میرے خاندانی حالات سے واقف ہو جائیں گے۔ جو مصائب مجھے اور میرے خاندان کو گذشتہ ۲۷ سال میں اُٹھانے پڑے ہیں ان کا تذکرہ بھی آ گیا ہے۔ اک تارک وطن کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر ان مشکلات کا ذکر نہ کرتا تو یہ خط اور کہانی جسدِ بے رُوح ہو کر رہ جاتی۔ اصل میں میرے ذاتی مصائب اور حالات پورے سماج کی دردناک کہانی ہے۔ مسلم معاشرے کی ایسی تصویر ہے جس کے خدو خال بہت ہی نمایاں ہیں۔ جب تک ہمارا معاشرہ اور سماج دینی، سیاسی اور سماجی طور طریقوں اور رسم و رواج کو نہیں بدلے گا۔ اس وقت تک مسلم معاشرہ کی پسماندگی اور پستی میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ میں نے اپنی کہانی میں قاری کا بے حد خیال رکھا ہے۔ لیکن کہیں کہیں میری رُوح کچھ زیادہ بے قرار و بیتاب ہو گئی ہے۔

ے
کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

بزرگوں کے تذکروں کو میں نے کہانی میں بڑی اہمیت دی ہے ان بزرگوں کی ذاتِ اقدس سے جو فلسفہ زندگی ظہور میں آیا ہے۔ اس فلسفہ کی موشگافیاں بھی کی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ پڑھنے والے ان حالات اور موشگافیوں سے فائدہ حاصل کریں گے۔

حصہ دوم میں میں نے پارلیمنٹ کی کارروائی اور پارلیمنٹ کے ممبروں کی تقریروں کی پوری تفصیل دی ہے۔ اسی کے ساتھ محترمہ وزیر اعظم کا وہ بیان بھی شامل کیا ہے جو کہ انھوں نے صدر کے ایڈریس پر شکریہ کی تقریر کرتے ہوئے دیا تھا۔ محترمہ اندرا جی کے بیان کے ساتھ جناب گورنر بہار [illegible] کا پورا بیان دیا ہے جس میں موصوف نے مسئلہ کے دونوں پہلوؤں پر

گفتگو کی ہے۔ باقی جو مضامین ہیں وہ جمعیۃ العلماء ہند۔ کمیونسٹ پارٹی۔ سی۔ پی۔ آئی۔ اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بیانات میں جو ان ہی جماعتوں کے اخباروں سے دیئے ہیں۔ اس بات کا میں نے خاص خیال رکھا ہے۔ کہ کوئی بات غیر مستند نہ ہو، اس کتاب کے کسی ... پر ان تمام بیانات کے حوالے درج کردیئے ہیں۔

انتساب میں ندرت خیال سے کام لیا ہے بعض جگہ شعر لکھ دیئے ہیں۔ جو کہ قاری کو غور و فکر کے نئے راستے کی طرف رہنمائی کریں گے۔ اگر اپوزیشن پارٹی کی گرماگرمی سے طبائع کو حظ محسوس ہوتا ہے تو برسر اقتدار پارٹی کو بھی تمام حالات پر تبصرہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ قاری کے لئے معاملات کی یک طرفہ تصویر بنانے سے کوئی فائیدہ نہ ہوگا۔

اس کے باوجود میرے قلم سے اگر کوئی لفظ نامناسب اور زائد نکل گیا ہو۔ اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔

یہ تصنیف و ترتیب دلّی کے تمام ہندوؤں مسلمانوں کی خدمت میں پیش ہے۔

"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی

انھیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی

ہندوؤں، مسلمانوں کا دوست اور سب کا بھائی:۔

عزیز الرحمٰن جامعی ۔ لدھیانوی ثم دہلوی

کوچہ رحمان دہلی ۶ (۱۵ مارچ ۱۹۷۵ء)

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

دلّی کی کہانی

۵/مارچ ۱۹۷۵ء

عزیزم محمد انور سلمہٗ۔ سلام مسنون۔

خیریت! آپ کا خط ملا۔ عزیزہ زبیدہ اور بچے دلّی آئے اور آگرہ تا فاناً چلے گئے۔ یہی آپ کو یاد کرتا ہوں تو فوراً میری زبان پر یہ شعر جاری ہو جاتا ہے۔ ؎

وہ آئے بھی اور بیٹھے بھی اُٹھ کر چلے گئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

بچے دستر خوان پر بیٹھتے ہیں تو آپ دونوں کی یاد بچوں کی محبت رہ رہ کر ہمارے وجدان میں اس طرح بیدار ہوتی ہے گویا ہم اور آپ لوگ ساتھ ہی بیٹھے ہیں۔ ساتھ ہی کھا رہے ہیں۔ جذبات کا ایسا طوفان ہے کہ اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ گویا غالب نے ہمیں لوگوں کے لئے کہا تھا۔ ؎

اُلفت کا جب مزہ ہے کہ ہوں وہ بھی بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

اقبال نے اسی تعلق خاطر۔ محبت۔ اور انسانی جذبات کی یوں ترجمانی کی ہے۔ کہ محبت کی لہریں کس طرح ایک دوسرے میں سما جاتی ہیں۔ جن لہروں کی نہ کوئی ابتدا ہوتی ہے نہ انتہا۔ ؎

محبت خویشتن بینی محبت خویشتن داری
محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پرواہ

زمانہ جہاں اپنے ساتھ مسرتیں لاتا ہے۔ وہاں غم بھی چھوڑ جاتا ہے۔ سماجی زندگی میں انسان غم و الم اور خوشی و مسرت کے درمیان زندگی بسر کرتا ہے۔ دیکھئے آپ ہی آئے اور چلے گئے۔ زبیدہ سے کتنی دیر کے لئے ملنا ہوا۔ ندیم۔ عنبریں اور ریبردین۔ گل و بلبل کی

طرح جھکے اور بلا پوچھے ہی چل دیئے۔

ع ہم دیکھتے ہی رہ گئے اور کارواں نکل گیا

سنیئے یہ فلمی شعر ہے لیکن ہم دلی والوں کے جذبات کی کس طرح جذبات انگیز ترجمانی کر رہا ہے۔

ابھی نہ جاؤ چھوڑ کے کہ دل ابھی بھرا نہیں

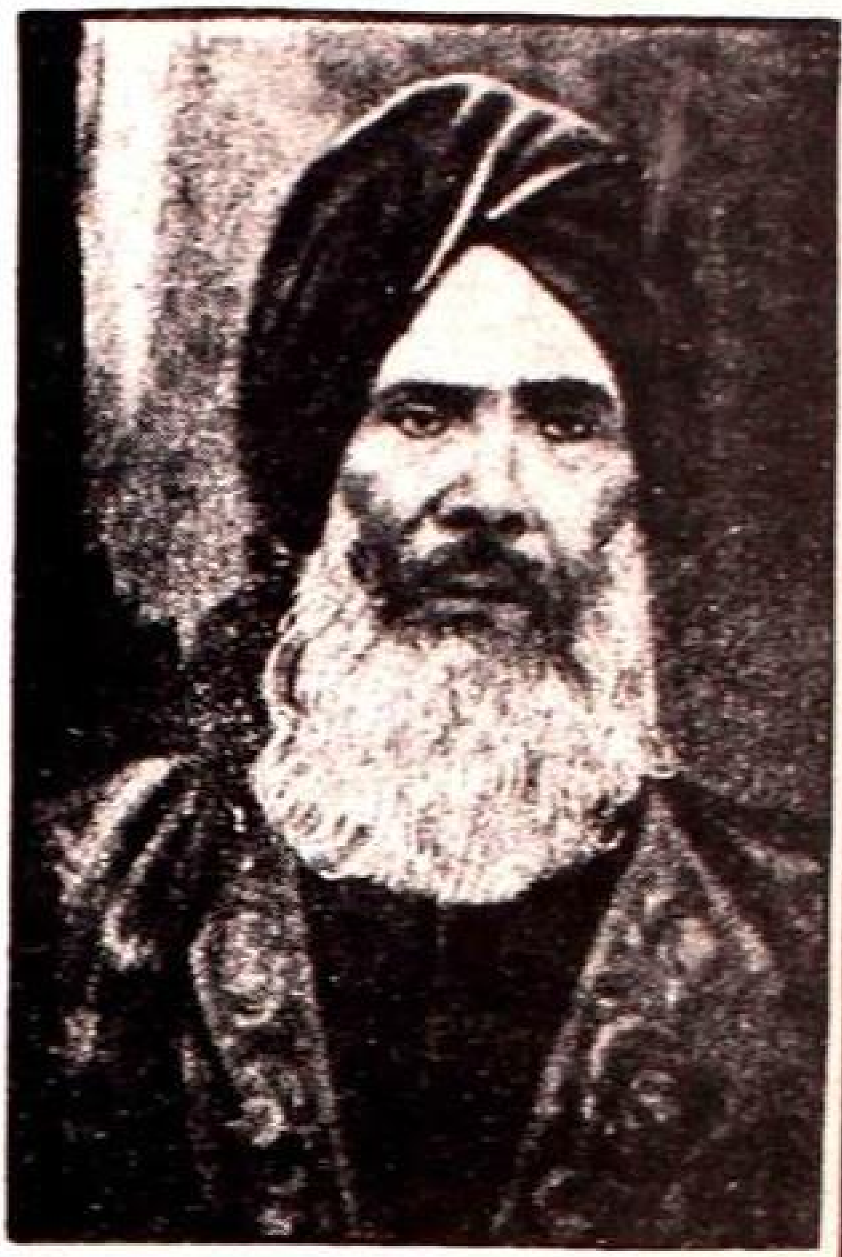
ہمارے گھر میں چودھویں کے چاند کی طرح ٹھنڈی روشنی یو۔ کے۔ سے آئی اور ابھی کچھ وقت بھی نہ گزرا تھا کہ بس دیکھتے ہی دیکھتے اپنی آنکھوں کے سامنے روشنی اس طرح اندھیرے میں تحلیل ہو گئی جس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ طبیعت اب بھی آپ کی یاد سے بے قرار ہے۔ محبت کے جذبات ہیں کہ کہہ رہے ہیں۔ ~

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا ÷ میری خاک جگنو بنا کر اڑا

میری ناؤ گرداب سے پار کر ÷ یہ ثابت ہے تو اس کو کر

مطلب یہ ہے کہ اے جذبۂ عشق ہمیں وہاں تک پہونچا دے جہاں ہمارے عزیز و اقارب محبت کی میٹھی نیند سوتے ہیں سکون سے جاگتے ہیں۔ قدرت نے انھیں بھرپور زندگی بسر کرنے کا موقعہ دیا ہے۔ وقت ان کا ساتھ دے رہا ہے۔ پُر مسرت حالات نے ان سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ خدا کرے کہ زندگی کی یہ کشتی اسی طرح شاداں و فرحاں زمانے کے سمندر پر تیرتی ہوئی منزل مقصود پر پہونچ جائے۔ بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖىهَا وَمُرۡسٰىهَا۔

عزیز من! ایک زمانہ تھا کہ دلی میں سلجوقی آباد تھے۔ درانیوں کا راج تھا۔ تاشقندیوں کا تدبر تھا۔ ایرانیوں کی حکمرانی اور حکمت عملی تھی۔ یہ تو بس حکومت کی باتیں ہیں۔ جو بھولی بسری داستانیں ہو گئیں۔ حکومت کے علاوہ ہندوستان کے حکمراں تاشقند، بخارا، سمرقند، کابل و قندھار اور ایران کا بقول مولانا ابوالکلام آزاد بے پناہ حسن اور علم و ہنر کا طوفان لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ ان حسین لوگوں کی تعداد ایک کروڑ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ ان کا حسن بھی کیا حسن تھا۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ دلی کی ہر ہر



امیر مینائی

منشی امیر احمد مینائی نام۔ امیرؔ تخلص۔ مولوی کرم محمد لکھنوی کے صاحبزادے ۱۸۲۸ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے نسبتاً حضرت مخدوم شاہ مینا قدس سرہٗ سے تعلق ہے جن کا مزار لکھنؤ میں ہے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے اور بعد میں علمائے فرنگی محل سے حاصل کی طبیعت بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل تھی چنانچہ اسیرؔ کے شاگرد ہوئے اس وقت شاہ نصیر الدین کا زمانہ تھا اور لکھنؤ فضل و کمال کا مرکز بنا ہوا تھا ایک طرف آتشؔ و ناسخؔ کے درمیان مناظرے ہو رہے تھے دوسری طرف انیسؔ و دبیرؔ کے معرکے ان تمام چیزوں نے امیرؔ کی شاعری کو بہت جلد ترقی کے منازل طے کرا دئے اسی وقت سے امیرؔ کی شہرت ہونی شروع ہوئی جب ۱۸۵۷ء کی قیامت آفریں شورش مٹ گئی اور اودھ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو آپ کو نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور نے طلب کیا پھر نواب کلب علی خاں کی حکومت ہوئی رامپور میں ۴۳ برس عزت و آبرو سے بسر کئے۔ پھر حیدرآباد دکن چلے گئے اور ۱۹۰۰ء میں وہیں انتقال کیا۔

لی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

امیر مینائی



ذوق دہلوی

شیخ محمد ابراہیم نام۔ ذوق تخلص۔ ۱۲۰۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے
ذوق کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی ـــــ تھے
ابتدائی تعلیم معمولی ہوئی۔ لیکن اپنے کثرت مطالعہ سے سب کچھ حاصل کر لیا
حافظ غلام رسول شوق کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا بعد میں شاہ
نصیر دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ شاہ نصیر شاعری میں بہادر شاہ
ظفر آخری تاجدار دہلی کے استاد تھے جب شاہ نصیر دکن چلے گئے تو
بہادر شاہ نے ذوق کو اپنا استاد بنالیا بادشاہ کے استاد ہونے سے ذوق
کو اور بھی چار چاند لگ گئے۔ ذوق کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے
زبان کو خوب صاف کیا اور اس پر جلا دی وہ الفاظ کی نشست اور
ان کے مناسب استعمال سے کماحقہ واقف تھے محاورات اور امثال کے
استعمال میں وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ۱۲۷۱ھ میں دہلی میں انتقال
ہوا۔ مرنے سے چند گھنٹے پیشتر یہ شعر کہا۔

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا ٭ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

(ذوق)

گلی میں حُسن کی شوخیاں اور عشق کی گرمیاں موجود تھیں۔ دِلّی میں جو آیا دل پکڑ کر رہ گیا۔ چلتے چلتے لوگ بیٹھ گئے اور دوڑتے دوڑتے کھڑے ہو گئے۔ جہاں تک نظر گئی، اور جہاں تک نظر اٹھی۔ حُسن لہراتا ہوا نظر آیا۔ پھول کھلے ہوئے تھے۔ دِلّی کے گلی کوچے معطر تھے۔ یہاں قدم قدم پر حسین پردے حُسن پر ڈال دیئے گئے تھے، تاکہ عاشقوں کو محبوب تک پہونچنے کے لئے کوہ کَن کا پورا راستہ اختیار کرنا پڑے۔ دلی کے حُسن کی بات یہاں تک پہونچی۔ کہ میر جیسا صوفی منش انسان بے اختیار کہہ اٹھا۔

دونوں ہاتھوں سے تھامیئے دل کو
میرؔ صاحب یہ شہر دلّی ہے

امیر مینائی جیسے عابد و زاہد شخص نے حُسن کے گلستاں کی یہ تعریف کی:۔

دِلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی!

مرزا غالب نے دِلّی کے اس گلستان کی اور محبت و عشق کے ان مسافروں کی اس طرح تعریف کی ہے، کہ جی چاہتا ہے کہ ہر وقت یہی پڑھتے رہیئے اور سر دُھنتے رہیئے اس شعر میں محبت کا کس قدر لطفِ بیکراں ہے جو کہا نہیں جا سکتا محسوس کیا جا سکتا ہے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

اسی زمانے میں ایک منچلے عاشق کا دِلّی سے گزر ہوا تو وہ بے اختیار والہانہ طور پر صدا لگانے لگا۔

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
کیسا پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

عزیزِ من!۔ کیا خوب زمانہ تھا۔ دِلّی کا ہر شخص چلتے پھرتے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان میں دِلّی کے گلی کوچوں میں پکارتا ہوا نکل جاتا تھا۔ ؎

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی
بازارِ خویش آتشِ ما تیز می کنی

عزیز من - ! یہ تذکرہ میں پندرھویں اور سولہویں صدی کا کر رہا ہوں۔ جن لوگوں نے دِلّی میں دادِ عیش دی وہ کب کے گزر چکے "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا" اٹھارہویں صدی تک دِلّی اپنے حُسن وشباب سے گزر چکی تھی۔ دِلّی کو کہیں اپنوں نے لوٹا، کہیں نادر شاہ درّانی نے دِلّی کے حُسن وجمال کو کنویں میں دفن کیا اور تخت طاؤس لے کر دِلّی سے چلتا بنا "شامتِ اعمال ما صورتِ نادر گرفت۔"

کمپنی بہادر کے انگریز فوجیوں اور کارکنوں نے عوام کو آپس میں لڑوا کر وہ قتل عام کرایا۔ کہ دِلّی آج تک خون کے آنسو بہا رہی ہے۔ ہائے ہائے آخر وہی ہوا جس کا گمان بھی نہ تھا۔ دِلّی کا حُسن وشباب لُٹ گیا۔ "خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں۔"

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں
بس کہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہوگئیں
یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

اس لُٹی پِٹی خانماں برباد دِلّی کا غم میرؔ تقی میرؔ کہہ سکا۔ اس پر غم کے بادل چھا گئے۔ اب یہاں دِلّی میں کون تھا جو میرؔ کی ڈھارس بندھواتا۔ وہ چہرے کہاں تھے۔ جس پر میرؔ کی شاعری کا دارومدار تھا۔ حُسن مٹ چکا تھا۔ اور عشق خانماں برباد تھا۔ یہ کمپنی کا دور تھا۔ جہاں یہ اعلان کیا جاتا تھا "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، اور حکم کمپنی بہادر کا۔"

بادشاہ کی بے کسی، آپس[1] کا قتلِ عام، عوام کی بھوک، کمپنی بہادر کے فوجیوں کا ظلم و ستم میر سے برداشت نہ ہو سکا۔ اور یہ کہتے کہتے۔

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی!

چاہیں سو تو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

دلّی کو خیر باد کہہ کر لکھنو چلا گیا۔

میر دلّی سے لکھنو پہونچے تو ایک مجلس مشاعرہ میں اپنا تعارف اس طرح کرایا کہ اہلِ مجلس تڑپ اٹھے اور ہر طرف سے صدا آئی کہ کیا یہ میر تقی میر ہیں۔ میر کے ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ غم کی آنچ نے نہ صرف میر کے صبر و سکون کو چھین لیا تھا، بلکہ وہ دلّی کی کربلا پر ماتم کر رہا تھا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو! ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے جہاں منتخب روزگار کے

جس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا

ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

میر تو دلّی سے لکھنو جا کر دلّی کے غم میں گھلتے گھلتے خدا سے جا ملے۔ میر کے بعد دلّی کا وارث غالب ہی رہ گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کا المیہ غالب کے سامنے گزرا۔ انگریزی تلوارِ بے نیام نے وہ جوہر دکھائے کہ نہرِ سعادت خاں کی دو رویا لہریں پانی کے بجائے خون سے کھیلتی ہوئی لال قلعے سے نکلیں اور چاندنی چوک عبور کر کے دلّی کے باہر کھیتوں میں جذب ہو گئیں۔

اس خون آشام دور میں بھلا غالب کیسے بچ نکلتے۔ بلیماران کے انگریز کمانڈر نے غالب کو گرفتار کیا اور پوچھا تم کون ہو؟ غالب نے جواب دیا۔ آدھا کرسٹائن اور آدھا مسلمان — کمانڈر نے پوچھا یہ کیسے؟ غالب نے جواب دیا۔ شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا — اور فوراً ہی وزیر ہند کا خط کمانڈر کے سامنے پیش کیا جو وفاداری کا ثبوت تھا۔ اس طرح غالب کی جاں بخشی ہوئی۔ اب دلّی میں کیا رکھا تھا۔ باقیات

---

[1] انگریز کمپنی کے کارندے دلّی کے لوگوں کو بات بات پر لڑوایا کرتے تھے۔ یہ انگریز کمپنی کی حکمت عملی تھی۔

وسائل حیات کو انگریزوں نے ختم کر دیا۔ دِلّی کا حُسن کلکتے کے مٹیا برج میں دفن ہوا اور اس حُسن و شباب کی فاتحہ رنگون میں پڑھی گئی۔ غالب اس بربادی پر یوں رو دیا۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی | کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے | نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی | اب کسی بات پر نہیں آتی

خیر یہاں تک بھی بات رہتی تو غنیمت تھی ۱۸۵۷ء کا المیہ تو وہ المیہ تھا جس کی شدت کا بوجھ غالب جیسا متحمل مزاج آدمی بھی برداشت نہ کر سکا۔ جو خدا کے حضور نقش فریادی تھا اور جس نے اپنی ہستیٔ فانی کو کاغذی پیرہن میں پیش کیا۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

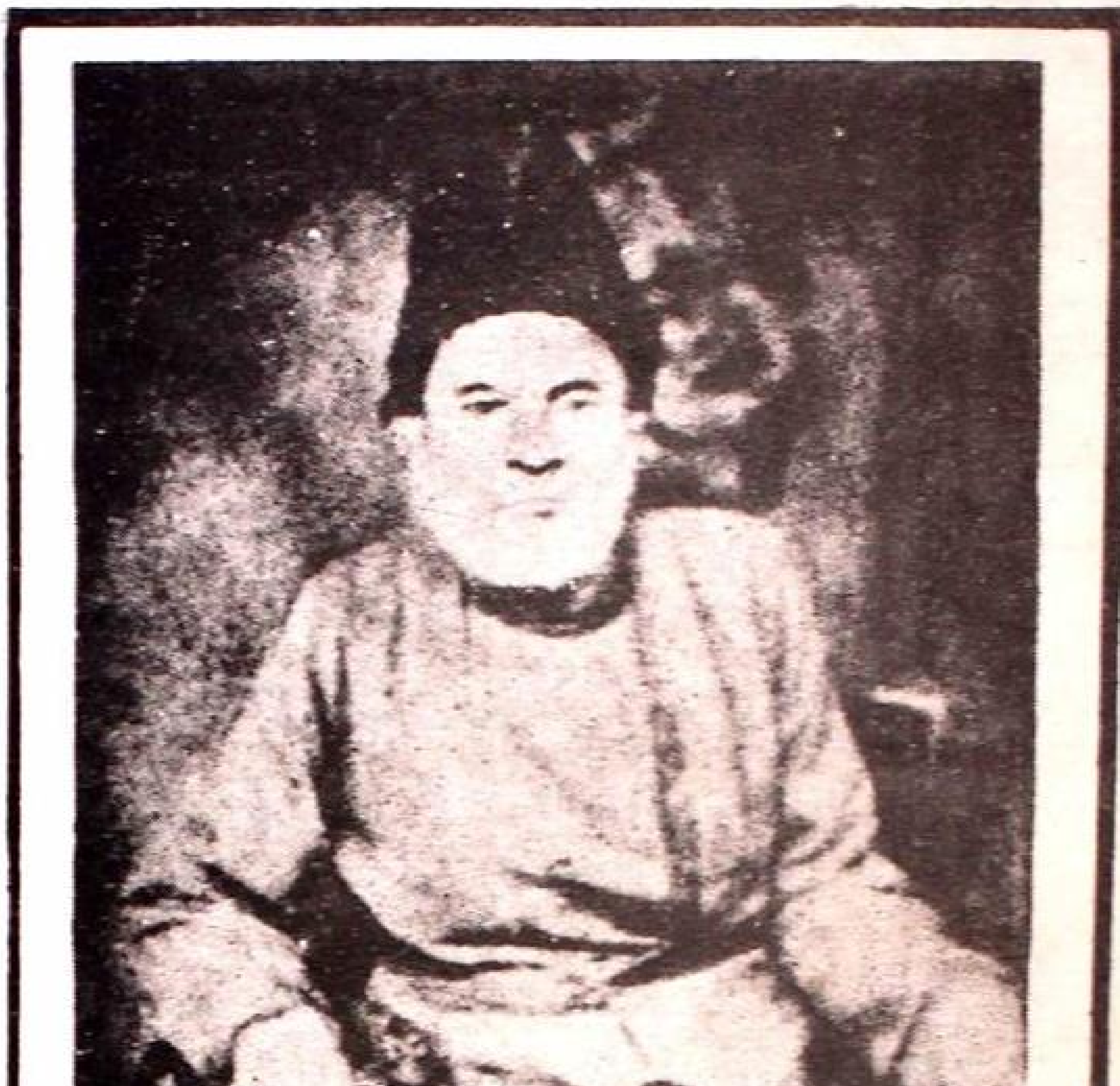
وہی غالب جو بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا تھا اسی غالب پر یاسیت، مجبوری معذوری، دل کی تباہی، دماغ کی پریشانی اس طرح غالب آگئی کہ وہ رنج والم اور حزن و ملال میں ثواب طاعت و زہد کو بھی نظر انداز کر گیا۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

غالب اس حال میں بھی اپنی شوخیٔ طبع سے باز نہ رہ سکا۔ انگریزی ظلم و جبر پر بھرپور طنز کی۔ اس طرح اپنی گرفتاری کا بھی نہایت اچھوتے انداز میں ذکر کیا۔ یہ غالب کا ہی کمال تھا جس نے وقت کے تشدد کو غزل کا حصہ بنا کر ۱۸۵۷ء کی تاریخ کی طرف بلیغ اشارہ کر دیا تاکہ تاریخ کے طالب علم راہ سے بھٹک نہ جائیں۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے پر وہ تماشہ نہ ہوا

۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک غالب کے انتقالِ پُرملال کا زمانہ آیا اس۔ دِلّی پر ایک نگاہ ڈالی وہ چھڑی ٹیکتا ٹیکتا گھر سے راج گھاٹ تک گیا۔ اور اس



غالب اور ۱۸۵۷ء کا المیہ

غالب یوں رویا

ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ — تارِ نفس، کمندِ شکارِ، اثر ہے آج
ماقبت، کنارہ کر، اے انتظام چل — سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

(غالب)



مومن دہلوی

حکیم مومن خاں نام۔ مومن تخلص۔ دلی کے رہنے والے ۱۸۰۰ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خان تھا دادا نامدار خاں کشمیر سے آئے تھے اور بحیثیت شاہی حکیم مقرر ہوئے۔ مومن کے والد کو شاہ ولی اللہ دہلوی کے خاندان سے بڑی ارادت تھی چنانچہ مومن کا نام شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے رکھا اور شاہ عبدالقادر صاحب سے درس طلا کامل طب ہونے کے علاوہ علم نجوم میں بھی ان کو ملکہ تھا تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا۔ مومن نے غزل کا پورا حق ادا کیا ہے اور صحیح معنوں میں غزل کہی ہے نہ فلسفہ حکمت کی ثقالت ہے نہ عرفان و تصوف کی پرواز گویا ان کا کلام گذری ہوئی حکایت یا منظوم سرگذشت ہے جس میں اسلوبِ بیان نے چار چاند لگا دئے ہیں یہی ان کے کلام کی خصوصیت ہے انہوں نے اپنے انداز بیان میں عجیب ندرت اور نازک خیالی سے کام لیا ہے۔ مومن نے کبھی کسی کی مدح نہیں کی نہ کبھی رؤسا کے دربار میں حاضر ہوئے دلی میں ۱۸۵۱ء میں انتقال کیا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(مومن)

ں اُس پر کیا گزری۔ اپنے شاگرد میر مہدی مجروح اور منشی تفتہ کو لکھا :۔

"میرا حال تو یہ ہے کہ خس کی ٹٹی، پُروا ہوا اب کہاں وہ لطف تو اسی مکان میں
ھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت، اور سمت بدلی ہوئی ہے۔ بہر حال میگذرد۔
ہر حال میں گذارہ کر رہا ہوں۔)

مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا ہے۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم
ھاری ہو گئے ہیں۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے ہیں۔ لیکن اب ان میں گرم پانی نکلتا ہے۔
سوں میں چھپڑی ٹیکتا ٹیکتا کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ جامع مسجد سے
اج گھاٹ کے دروازہ تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر پڑے
یں۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کئی بانس نشیب تھا وہ ملبہ سے پُر ہو کر
ب باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ صرف
صیل کے کنگورے نظر آتے ہیں۔ باقی سب اَٹ گیا ہے۔

کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک سے کابلی دروازہ تک
یدان ہو گیا۔ (۱۸۵۷ء میں آہنی سڑک سے کابلی دروازہ تک کی تمام عمارتیں انگریزوں
نے گرا کر زمین کے برابر کر دی تھیں۔ اب کابلی دروازہ تک میدان ہی میدان نظر آتا تھا۔
الب کی زبان سے اب شہر کا اور حال سنیئے)

پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی
ویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، اب ان میں سے
سی کا پتہ نہیں ملتا۔ سب ختم ہو گئے۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ شہر صحرا ہو گیا۔ اب جو کنوئیں بند ہو گئے تو پانی گوہر نایاب
ہو گیا۔ دِلّی صحرا کیا ہے صحرائے کربلا ہو گیا۔ اللہ اللہ دلّی والے اب تک یہاں کی
زبان کو روتے ہیں۔ اُردو زبان کے عاشق۔ قتل ہو گئے۔ مر گئے یا بھاگ گئے۔
لئے رے حسنِ اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا اُردو بازار نہ رہا تو اُردو کہاں اور دلّی کہاں،
اللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے چھاؤنی ہے۔ اب دلّی کا حال یہ ہے کہ نہ قلعہ ہیں رو

ہے، نہ شہر میں نہ بازار میں اور نہ نہر سعادت خاں کے کنارے (یہ نہر چاندنی چوک سے گذر کر سبزی منڈی کے کھیتوں میں چلی جاتی تھی)

دِلّی میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق۔ سو وہ سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے۔ جو اتنے عزیزوں کا ماتم کروں؟! اس کو زندگی کیوں نہ دشوار ہو جائے۔ "ہائے اتنے یار مرے کہ اب جو میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔

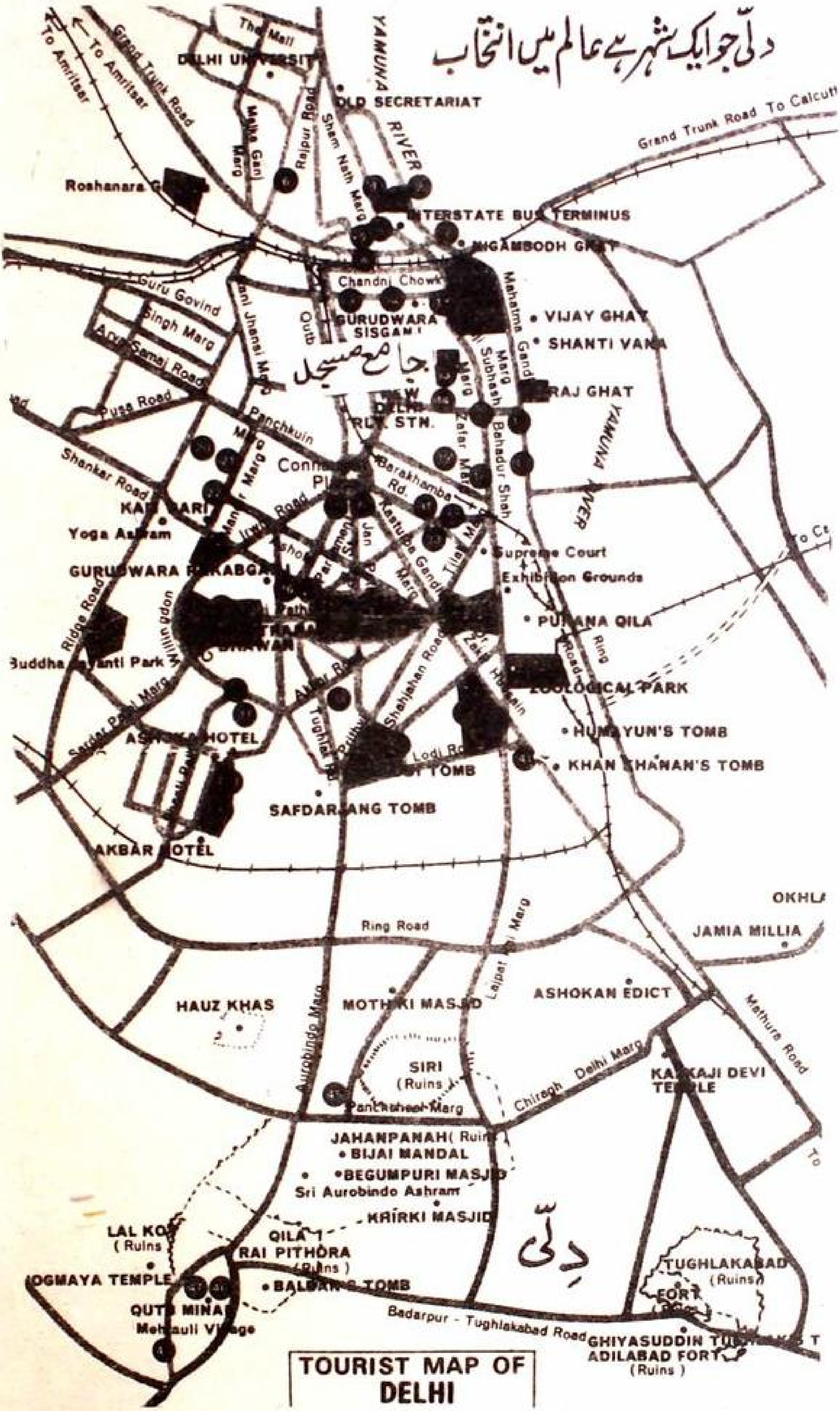
غالب (جولائی ۱۸۵۷ء)

یہ کہتے کہتے کہ میرے مرنے کے بعد کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ غالب رو دیا۔ وہ غم کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ غالب دِلّی کو یاس و حرماں کے ماحول میں چھوڑ کر اپنے خدا سے ملنے کے لئے بیتاب تھا۔ امرار دِلّی قتل ہو چکے تھے جو بچے تھے وہ دِلّی سے بھاگ گئے تھے۔ دِلّی کا حُسن خاک و خون میں تڑپ تڑپ کر ختم ہو رہا تھا۔ کوئی کسی کا نہ تھا۔ جو کسی کا تھا دم نہ بھر سکتا تھا۔ گلی کوچوں میں لوگ انگریز کے خوف سے تھرتھرا رہے تھے۔ چاندنی چوک کے ساتھ بنی ہوئی عظیم الشان حویلیوں کے دروازے کھٹکھٹا کر انگریز گورے چیخ رہے تھے۔ "لال بی بی" دو ورنہ گولی مار دیں گے۔ دِلّی کی حسیناؤں کا نام "لال بی بی" رکھا گیا۔ جو مریم کی طرح معصوم اور سیتا سے زیادہ مقدس تھیں۔ دِلّی کی عصمت آما بی بیوں کی عصمت سرِ بازار لٹ رہی تھی۔ لوگ در و دیوار سے ٹکرا رہے تھے۔ دِلّی والوں پر کھانا پینا سب بند تھا۔ جو مکان سے باہر نکلتا۔ اور پانی کی تلاش میں قدم بڑھاتا وہ کاری زخم کھا کر خون میں نہایا ہوا گھر لوٹتا۔ گردنوں کی کوئی قیمت نہ تھی۔ بے دریغ کٹ رہی تھیں۔ فتحپوری سے جامع مسجد تک پھانسیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ جامع مسجد کے دروازوں اور میناروں سے آہ و بکا نکل رہی تھی۔ انگریز کے سرکش گھوڑے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ہنہنا رہے تھے۔ انگریز حکومت کے نشے میں ظلم و ستم کی ایک تاریخی داستان مرتب کر رہا تھا۔ اس عظیم الشان جمہوری قوم کی عقل نذرِ دجوا باد و سے گئی تھی۔



۳۰/ مئی ۱۸۵۷ء کو جب انگریز کے سرکش گھوڑے اور قاتل گورے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اور سیڑھیوں کے سامنے بے دریغ لوگوں کی گردنیں اُڑا رہے تھے تو سرمد شہید کے مزار سے یہ آواز آ رہی تھی۔ یہی وہ آواز تھی جس نے ہندوستان میں ابوالکلام۔ گاندھی اور جواہر لال جیسے مجاہد پیدا کئے اور ملک انھیں کی قیادت میں ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء میں آزاد ہو گیا۔

تمھیں سے اے مجاہدو جہان کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
کٹیں جو چند گردنیں تو قوم میں ہو زندگی
لہو جو ہے شہید کا وہ قوم کی زکات ہے



TOURIST MAP OF DELHI

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ج وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ﴿۳۴﴾ (سورۂ نمل) ترجمہ:- جب بادشاہ کسی بستی میں فاتحانہ داخل ہوا کرتے ہیں تو بستی کو برباد کر ڈالتے ہیں۔ اور وہاں کے عزت دار باشندوں کو ذلیل کرتے ہیں۔ اور یہ لوگ ایسا ہی کریں گے۔

پھر اگر غالب یہ نہ کہتا تو کیا کہتا۔ اس طرح نہ روتا تو پھر کس طرح روتا۔ ہائے ہائے کیا مایوسی تھی، کیا بے کسی کا عالم تھا۔

وہ غالب جو اعلیٰ حضرت نواب دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی آنکھ کا تارا اور دلّی والوں کا شاعر خوش نوا تھا۔ اس قدر غم زدہ تھا کہ اسے یہ دنیا پسند ہی نہ تھی وہ جلد از جلد اپنے مولا سے ملنے کی آرزو کر رہا تھا۔ اس بے کسی کے عالم میں غالب کے پاس صرف یہی کہنے کو رہ گیا تھا ؎

غالب خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

غالب دلّی سے اس طرح گئے کہ دلّی کا پورا دور ہی ختم ہو گیا۔ شعر و شاعری اور حسن و شباب کی تمام محفلیں برباد ہو گئیں۔ شاعری نے ماتم و مرثیے کی صورت اختیار کی، تو مغل شہزادیاں سوزن کاری کا سہارا لے کر مغلانیاں بن گئیں۔ جن کے قدموں تلے بادشاہوں کے تخت و تاج ہوتے تھے وہ ریشمی پیوند کاری کے بغیر نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئیں۔

دلّی کا یہ عالم تھا کہ بات بات پر پکڑے جاتے تھے۔ مخبری شیوۂ وفاداری بن گیا تھا۔ دلّی کے پرانے انگریز پرست غدار پہرے پوری فرعونیت کے ساتھ سامنے آ گئے۔ شاید یہ لوگ اسی وقت کے انتظار میں تھے کہ کب صاحب کے مصاحب بنیں اور شہر میں اترا تے پھریں، صاحبو! عجب زمانہ تھا۔ انگریز کی محفل میں وفاداری کے کس کس طرح اور کیسے کیسے ثبوت دیئے گئے۔ یہ تمام حشر سامانیاں غالب کی چشمِ پُرنم دیکھ رہی تھی۔ جب مولانا محمد حسین آزاد کے والد مرزا باقر کو دار پر چڑھایا گیا تو اس کھلی ہوئی ناانصافی پر غالب بھلا کیسے خاموش رہتا۔ غالب نے کہا اور بجا کہا۔

بگڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

عزیزمن ! نہ معلوم دِلّی نے کتنے مصائب دیکھے ہیں۔ تباہی و بربادی کے کیسے کیسے دَور اس پر گزر گئے۔ کتنی سلطنتیں یہاں اُبھریں اور مٹ گئیں۔ کیسے کیسے وَلی اللہ، قطب اور ابدال آئے اور اپنی روحانی روشنی چھوڑ کر قبروں میں جا سوئے۔ اب اس دَور میں دِلّی میں رکھا ہی کیا ہے۔ حُسنِ خداداد کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اور نہ معلوم کتنی دیر تک بند رہیں گے۔ حالات کی رفتار یکساں نہیں رہتی۔ یہاں طوفانوں کی طرح لوگ آئے۔ اور خس و خاشاک کی طرح انقلاب کے سمندر میں بہہ گئے۔

ملکہ نورجہاں نے ہمارے لئے ایک تاریخ چھوڑی ہے۔ نورجہاں کیا تھی ؟۔ جہانِ حُسن کا آفتاب و ماہتاب۔ جس کی ایک نگاہِ غلط انداز نے جہانگیر جیسے بہادر کا دل جیت لیا تھا۔ جہانگیر کا سر حُسن کے حضور جھک گیا۔ اس واقعہ کے بعد نورجہاں نے عدل و انصاف کی حکمرانی میں ایک مظلوم کو بے خطا نشانہ بنایا۔ شبلی مرحوم نے عدلِ جہانگیری کے عنوان کے تحت اس قصّے کو اس طرح قلم بند کیا۔

غیرتِ حُسن سے ملکہ نے طمنچہ مارا
خاک پہ ڈھیر تھا ایک کشتۂ بے گور و کفن

آپ کو معلوم ہے پھر کیا ہوا وہ دیت اور خونِ بہا دے کر آزاد ہو گئی۔ مگر ایک مظلوم کا خونِ ناحق قدرت کو پسند نہ آیا۔ اور یہ خونِ ناحق سلطنتِ مغلیہ کو لے ڈوبا۔ اور یہ بات سچ ہو گئی کہ خدا مظلوموں کا حامی و ناصر ہے۔ خدا کے یہاں دیر تو ہے اندھیر نہیں۔ سُبحان اللہ، سُبحان اللہ، اللہ کا فیصلہ کیسا منصفانہ فیصلہ ہے۔ جہاں ایک مظلوم کی آہ تخت و تاج کیا پوری سلطنتِ مغلیہ کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گئی۔

عزیزمن ! یہ دِلّی ہے۔ ایک تاریخ کے بعد دوسری تاریخ، ایک دَور کے بعد دوسرا دَور، ایک سلطنت کے بعد دوسری سلطنت۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی دِلّی آگ و خون سے تڑپنے لگی شریفوں کے مکان آگ کی لپیٹ

میں تھے۔ اس وقت دلّی کے ایک سوختہ جاں اور غم زدہ شاعر نے خدا کے نام پر دہائی دی۔ انسانیت کے نام پر ٹوکا، مگر بے سود تھا سب کچھ کسی نے بھی نہ یاری کی۔

یہاں نہ خون بہاؤ یہ شہرِ دلّی ہے
یہاں نہ آگ لگاؤ یہ شہرِ دلّی ہے

دلّی میں ہر طرف آگ لگ رہی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ اسی دلّی میں ایک مردِ حق پرست اٹھا جس نے یہ اعلان کیا کہ میں دلّی میں آگ و خون کا کھیل اپنی جان دے کر بند کروں گا۔ یہ مردِ حق پرست کون تھا — "**گاندھی جی**"۔ گاندھی جی کی اس عظیم قربانی نے واقعی اس آگ و خون کے کھیل کو بند کر دیا۔ مہاتما گاندھی اپنی جان سے گئے۔ مگر دلّی کو ایک جان دے گئے۔ برلا ہاؤس میں ان کا خونِ ناحق بہہ رہا تھا۔ تو دلّی کے گلی کوچوں میں بے دریغ خون بہاتے ہوئے "درندے اپنے بھٹوں کو واپس ہو رہے تھے۔" **مہاتما گاندھی** کی چتا کو آگ لگ رہی تھی۔ تو دلّی میں آگ کے شعلوں کو پانی سے سرد کیا جا رہا تھا۔ دلّی بچ تو گئی مگر مغموم و معذور دلّی پر خوف و دہشت طاری تھی۔ دلّی اجڑ چکی تھی۔ یہاں کے لاکھوں مکین نقل مکانی کر کے جا چکے تھے۔ اب جو چہرے تھے وہ نئے تھے۔ دلّی کا معاشرہ جانی پہچانی صورتوں سے محروم ہو گیا۔ دلّی کی تاریخ "میں" کیا لکھوں اور کیسے لکھوں۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا اور درمیان میں آ گئی تھی سخن گسترانہ بات۔ ورنہ میں تو پرانی ہی دور کی دلّی کا تذکرہ کر رہا تھا۔ میر و غالب کی دلّی تو آپ پڑھ چکے ہیں۔ ذرا داغ کی دل کی طرف دیکھیے۔ راجہ ڈھلو کی ڈھلی۔ پٹھانوں اور مغلوں کی دہلی اور شاعروں کی دلّی بس کیا تھی۔ داغ کے یہاں دلّی مرحوم کا نقشہ بھی ہے وہ حال کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ داستان دراز بھی ہے اور دل گداز بھی۔ داغ دلّی کے شاعروں کی آخری کڑی تھے۔ داغ نے دلّی کے لئے یوں آنسوں بہائے کہ ہر دیکھنے والا رو پڑا۔ دلّی میں انگریزی حکومت کا ظلم و ستم شباب پر تھا۔ دلّی کا رنگ زرد اور سینہ چاک تھا۔ اس زرد رو دلّی کے متعلق داغ کہتے ہیں۔

فلک، زمین و ملائک جناب تھی دِلّی　　بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دِلّی
جواب کا ہے تو تھا لاجواب تھی دِلّی　　مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دِلّی

پڑی ہے نظر وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خدا ہی جانے اسے کھا گئی نظر کس کی

دِلّی کے شاعروں ہی نے دِلّی کی تعریف میں قصیدے نہیں پڑھے۔ یہاں جو آیا، قصیدے ہی پڑھتا چلا گیا۔ دربارِ خاص کی پیشانی پر آج بھی یہ شعر لکھا ہوا نظر آتا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

عزیزمن! دِلّی کی کونسی داستان لکھوں اور کونسی داستان چھوڑ دوں۔ انگریز کا دَور کا تھا جہاں ظلم و ستم کی کہانی مرتب ہو رہی تھی۔ ظفر علی خاں اور اکبر الہ آبادی۔ اسی دَور کے شاعر تھے۔ جب اِن شاعروں کے دل پر ظلم و ستم کی چوٹ لگی تو وہ پکار اُٹھے۔

قریب ہے یارو روزِ محشر، چھُپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

ظلم و ستم پر اکبر الہ آبادی نے کیا خوب طنز کیا ہے جو ظلم و ستم کی تاریخی داستانوں کو دہراتا ہے اور دہراتا رہے گا۔

وہی قاتل، وہی مخبر، وہی عادل نکلے
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

میں تو دِلّی کی پرانی داستانیں لکھ رہا ہوں تاکہ آپ دِلّی والوں کی داستانِ حیات سے واقف ہو جائیں۔ دِلّی والوں کی یہ داستانیں جو رزمیہ بھی ہیں، اور بزمیہ بھی۔ یہاں عروج بھی ہے اور زوال بھی۔ یہ داستانیں ۱۵۰۱ء سے شروع ہو کر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک لکھی جاتی رہی ہیں۔ شاعروں نے جو المیہ اشعار کہے ہیں وہ دِلّی کے زرد اور مظلوم چہرے پر ماضی کی بے کسی کا غازہ ہیں۔

باقی رہا۔ آپ نے میری خیریت پوچھی ہے۔ بچّوں کے متعلق محبت کا اظہار



داغ دہلوی

نواب مرزا خان نام ۔ فصیح الملک خطاب ۔ داغ تخلص ۔ دلی کے رہنے والے ۱۸۳۱ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے والد کا نام نواب شمس الدین خان چھ سال کے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ ان کی والدہ نے فتح الملک مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو ولی عہد بہادر شاہ ظفر سے نکاح کر لیا جس کی وجہ سے لال قلعہ دہلی میں رہائش ہوئی اور بہترین تعلیم و تربیت پائی بہادر شاہ ظفر داغ پر اس درجہ مہربان تھے کہ اصلاح شعر و سخن کیلئے اپنے استاذ ذوق کے سپرد کیا ۔ ۲۵ سال کی عمر تھی کہ مرزا فخرو نے انتقال کیا ۔ لال قلعہ کی رہائش ختم ہوئی۔ اس کے بعد غدر ہو گیا تو رامپور چلے گئے۔ یہاں نواب کلب علی خان نے ان کی بڑی قدر کی نواب کے انتقال کے بعد تمام شعرائے باکمال کا اجتماع درہم برہم ہو گیا تو داغ نے حیدر آباد دکن کا رخ کیا۔ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کے استاد مقرر ہوئے۔ فصیح الملک کا خطاب پایا ۔ داغ خوش گوئی میں بے نظیر اور بے ساختگی میں بے مثال تھے ۔ ۱۹۰۵ء میں جمعہ کے دن داغ نے بعارضۂ فالج حیدر آباد دکن میں انتقال کیا ۔

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلّی بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلّی

(داغ)

یہ شہر دلی ہے

اقبال عظیم

بہت نہ ٹھوکریں کھاؤ یہ شہر دلّی ہے
قدم سنبھل کے اٹھاؤ یہ شہر دلّی ہے

یہاں کی خاک عبارت ہے میرؔ و غالبؔ سے
یہاں نہ خاک اڑاؤ، یہ شہر دلّی ہے

یہ بادشاہوں کا مسکن نگر ہے ولیوں کا
یہاں تو ہوش میں آؤ، یہ شہر دلّی ہے

کہیں جواب نہیں جس کا نازنیں ہے یہ وہ
تم اس کے ناز اٹھاؤ، یہ شہر دلی ہے

نہ ہوگا اس کے درو بام پر ذرا بھی اثر!
ہزار شور مچاؤ، یہ شہر دلّی ہے

غرض بغیر یہاں دوستی کی رسم نہیں
سمجھ کے دوست بناؤ، یہ شہر دلی ہے

بہت ہے کوئی شناسا جو راہ میں مل جائے
کسی کے گھر بھی نہ جاؤ، یہ شہر دلی ہے

کسے خبر ہے کہ کب کس سے پھیرلے نظریں!
یہاں نہ پیار بڑھاؤ، یہ شہر دلی ہے

ہر اک چمکتی ہوئی شے گہر نہیں ہوتی!
فریب اور نہ کھاؤ، یہ شہر دلّی ہے

کہاں چلی ہو کسے دے رہی ہو یوں آواز
غریب دل کی صدا ؤ، یہ شہر دلی ہے

مرے لیے تو مرا شہر بھی جہنم تھا!
اُسے نہ اس سے ملاؤ، یہ شہر دلی ہے

حیات اتنی پریشان کیوں ہوئی اقبالؔ
سوال ہی نہ اٹھاؤ، یہ شہر دلی ہے

کیا ہے۔ عزیزہ زبیدہ نے کچھ والہانہ طور پر مجھ کو اور بچوں کو اور اپنی بہن کو یاد کیا ہے۔

زہے قسمت کوئی ہے تو سہی جن کے جذبات ہمارے لئے مچل رہے ہیں، جو درد وہاں ہے یہاں بھی ہے۔

ایک ہوک جگر سے اٹھتی ہے، ایک درد سا دل میں ہوتا ہے
ہم رات کو اٹھ کر روتے ہیں، جب سارا عالم سوتا ہے

عزیز من اور عزیزہ زبیدہ یوں تو خیریت ہی خیریت ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں جس کا تم کو وہم ہے۔ تمہارے اطمینانِ قلب کے لئے یہی کہہ سکتا ہوں۔ عزیزہ زبیدہ کو یہی دلاسہ دلا سکتا ہوں۔

تیرے نثار میرا حال پوچھنے والے
تیرا کرم ہے عنایت ہے جی رہا ہوں میں

مومن خاں مومن نے ہم لوگوں کے جذبات کی اس طرح عکاسی کی ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔ دلوں میں گہری مسرت لہریں لینے لگتی ہے۔ انسان آنکھیں بند کر کے اپنوں کے پاس پہونچ جاتا ہے۔ شعر کیا ہے۔ گویا فطرت بول رہی ہے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب اس شعر پر اپنا پورا دیوان مومن خاں مومن کے نام کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔

شرط یہ تھی کہ اگر مومن خاں مومن اپنا یہ شعر میرے نام ہبہ کر دیں تو میں اپنا پورا دیوان مومن خاں کے قدموں میں رکھ دوں گا۔ دیکھئے یہ محبت کی کتنی سچی تصویر تھی جو غالب کو بہت پسند آئی۔ اس شعر میں کتنا لگاؤ اور رچاؤ ہے۔ محبت کرنے والوں کی کتنی گہری تعریف ہے۔ گویا یہ دل کی گہرائیوں کی آواز ہے جسے محبت کرنے والے ہی سن سکتے ہیں محبت والفت کوئی کھیل نہیں ہے۔ جب انسان کو محبت کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ تو روح پکار اٹھتی ہے۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے

یہ شہر دلّی ہے

ا۔ عظیم

بہت نہ ٹھوکریں کھاؤ یہ شہر دلّی ہے
قدم سنبھل کے اٹھاؤ یہ شہر دلّی ہے

یہاں کی خاک عبارت ہے میر و غالب سے
یہاں نہ خاک اڑاؤ، یہ شہر دلّی ہے

یہ بادشاہوں کا مسکن نگر ہے ولیوں کا
یہاں تو ہوش میں آؤ، یہ شہر دلّی ہے

کہیں جواب نہیں جس کا نازنین ہے یہ وہ
تم اس کے ناز اٹھاؤ، یہ شہر دلّی ہے

نہ ہوگا اس کے در و بام پر ذرا بھی اثر!
ہزار شور مچاؤ، یہ شہر دلّی ہے

غرض بغیر یہاں دوستی کی رسم نہیں
سمجھ کے دوست بناؤ، یہ شہر دلّی ہے

بہت ہے کوئی شناسا جو راہ میں مل جائے
کسی کے گھر بھی نہ جاؤ، یہ شہر دلّی ہے

کسے خبر ہے کہ کب کس سے پھیر لے نظریں!
یہاں نہ پیار بڑھاؤ، یہ شہر دلّی ہے

ہر اک چمکتی ہوئی شے گہر نہیں ہوتی!
فریب اور نہ کھاؤ، یہ شہر دلّی ہے

کہاں چلی ہو کسے دے رہی ہو یوں آواز
غریب دل کی صداؤ، یہ شہر دلّی ہے

مرے لیے تو مرا شہر بھی جہنم تھا!
اُسے نہ اس سے ملاؤ، یہ شہر دلّی ہے

حیات اتنی پریشان کیوں ہوئی اقبال
سوال ہی نہ اٹھاؤ، یہ شہر دلّی ہے

کیا ہے۔ عزیزہ زبیدہ نے کچھ والہانہ طور پر مجھ کو اور بچوں کو اور اپنی بہن کو یاد کیا ہے۔

زہے قسمت کوئی ہے تو سہی جن کے جذبات ہمارے لئے مچل رہے ہیں، جو درد وہاں ہے یہاں بھی ہے۔

ایک ہوک جگر سے اٹھتی ہے، ایک درد سا دل میں ہوتا ہے
ہم رات کو اٹھ کر روتے ہیں، جب سارا عالم سوتا ہے

عزیز مومن اور عزیزہ زبیدہ یوں تو خیریت ہی خیریت ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں جس کا تم کو وہم ہے۔ تمہارے اطمینانِ قلب کے لئے یہی کہہ سکتا ہوں۔ عزیزہ زبیدہ کو یہی دلاسہ دلا سکتا ہوں۔

تیرے نثار میرا حال پوچھنے والے
تیرا کرم ہے عنایت ہے جی رہا ہوں میں

مومن خاں مومنؔ نے ہم لوگوں کے جذبات کی اس طرح عکاسی کی ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔ دلوں میں گہری مسرت لہریں لینے لگتی ہے۔ انسان آنکھیں بند کر کے اپنوں کے پاس پہونچ جاتا ہے۔ شعر کیا ہے۔ گویا فطرت بول رہی ہے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالبؔ اس شعر پر اپنا پورا دیوان مومن خاں مومنؔ کے نام کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔ شرط یہ تھی کہ اگر مومن خاں مومنؔ اپنا یہ شعر میرے نام ہبہ کر دیں تو میں اپنا پورا دیوان مومن خاں کے قدموں میں رکھ دوں گا۔ دیکھئے یہ محبت کی کتنی سچی تصویر تھی جو غالبؔ کو بہت پسند آئی۔ اس شعر میں کتنا لگاؤ اور رچاؤ ہے۔ محبت کرنے والوں کی کتنی گہری تعریف ہے۔ گویا یہ دل کی گہرائیوں کی آواز ہے۔ جسے محبت کرنے والے ہی سن سکتے ہیں محبت والفت کوئی کھیل نہیں ہے۔ جب انسان کو محبت کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ تو روح پکار اٹھتی ہے۔

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے

اگرچہ اس شعر کا مصرع ثانی اس مضمون سے متعلق نہیں۔ لیکن آپ کو پورا شعر سنائے دیتا ہوں۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

عزیز انور اور عزیزہ زبیدہ۔ آج کی محفل میں نہ جانے کیا کیا لکھ گیا ہوں۔ میرا جنوں مجھ پہ غالب ہے۔ مضامین اور اشعار ہیں کہ چلے آ رہے ہیں۔ ؎

بک گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ (ترمیم کے ساتھ) کچھ تو سمجھے خدا کرے کوئی

کیا کہوں بھائی۔۔ زندگی جہاں ساز بھی ہے جہاں سوز بھی، زندگی معراج بھی ہے اور تحت الثریٰ بھی، زندگی کوہ کن بھی ہے اور کوہ گراں بھی، زندگی حسن یوسفؑ بھی ہے اور دیدۂ یعقوبؑ بھی، زندگی صبر ایوبؑ بھی ہے اور عمرؓ فاروق بھی، زندگی عثمانؓ بھی ہے اور حسینؓ بھی، زندگی خلیلؑ بھی ہے اور کلیمؑ بھی، زندگی تخت و تاج بھی ہے اور خس و خاشاک بھی، زندگی تابناک بھی ہے اور شب تاریک بھی، اس زندگی سے انسان کو پیار بھی ہے اور نفرت بھی، کبھی یہ غزنوی ہے اور کبھی ایاز بھی، کبھی یہ طارق ہے اور کبھی بہادر شاہ ظفر بھی، زندگی سرمدؒ و حلاجؒ بھی ہے اور شبلیؒ و جنیدؒ بھی، کہیں ابوالکلامؒ اور محمود الحسنؒ ہے۔ اور کہیں حبیبؒ و بخاریؒ بھی، جو صدیق اکبرؓ کی طرح سوچتے تھے۔ فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح جاہ و جلال اور دبدبہ کے مالک تھے۔ زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے۔

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے — بج رہا ہے اور بے آواز ہے
لے نہ ٹوٹے زندگی کے ساز کی — زندگی آواز ہی آواز ہے

شاہدہ کو لکھ دینا ہم خیرات نہیں ڈالیں گے۔ ہدیہ پیش کریں گے۔ کوئی اپنے عزیزوں سے اس طرح مایوس ہو جاتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ جوں ہی حالات سدھر گئے اور لوگوں پر آجانے کی پابندیاں ختم ہو گئیں تو یقین جانو "ہیں" تمہاری آپا اور بچوں کو روز اوّل ہی بھیج دوں گا۔ اطمینان رکھئے۔ حالات کی سازگاری کا انتظار ہے۔

ہم اور تمہاری آپا۔ اور بچے۔ تم کو اور لاہور والوں کو نہ چاہیں گے تو پھر کس

و جائیں گے۔ یہاں اب ایسا کون ہے جو مونس و غمخوار ہے۔ ہم نے تو آ کر دیکھ ہی لیا تھا۔ ہ دلّی کا معاشرہ ہم سے سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس معاشرے کا تو یہ حال ہے کہ لا الٰہ الا اللہ سے کہیں دُور پہونچ گیا۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

عزیز من۔ ! دلّی کے مسلمانوں کو یہ کس طرح سمجھایا جائے اور کون سمجھائے کہ ہم لوگ عمر بن عبدالعزیز کی اولاد سے ہیں۔ جن کا سلسلہ نسب حضرت عمر فاروق رضؓ سے ل جاتا ہے۔ ۷۰ سال کے بعد یہ بات شدت سے محسوس ہونے لگی ہے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے

دلّی مُثبت بھی ہے اور منفی بھی۔ دلّی ڈاکٹر انصاری، اجمل خاں، مفتی کفایت بھی ہے و برادریوں کا وطن بھی ہے۔ دلّی ریل پیل کا تجارتی شہر ہے۔ حُسن کا گہوارہ بھی ہے۔ یہاں شاعر، موسیقار۔ رندِ خرابات بھی ہیں، شب بیدار زاہد و عارف بھی، جامع مسجد سے شاہ جہاں کی یاد تازہ ہے تو جامع مسجد کے سامنے مرقدِ آزاد بھی ہے۔ دلّی میں مورتی پُوجا کا عروج بھی ہے۔ تو صدائے اذان کی ضرب کاریاں بھی موجود ہیں۔ دلّی کا مسلمان سماجی اعتبار سے پس ماندہ۔ ہنرمندی میں یکتائے روزگار۔ تجارت میں خال خال۔ اقتصادی طور پر برباد۔

"یہ دلّی"

یہ دلّی یہ تجنانہ ذات و پات — جہاں زندگی ہے فقط سومنات
یہاں خاندانوں کے لات و منات — دلوں میں نہیں ہے سلام و صلات
انھیں دین سے ہے کہاں واسطہ — انھیں خاندانوں سے ہے رابطہ

یہ دلّی یہ بُت خانہ شش جہات — تراشیں ہیں اس نے بہت سومنات

پسند ان کو ہے خاندانوں کی بات
لگاتے ہیں رشتوں میں ذاتوں کی گھات

یہ دِلّی یہ بتخانۂ چشم گوش!
یہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش!
یہ رکشا یہ تانگے یہ موٹر کا جوش!
کسی کو کسی کا نہیں کوئی ہوش

دِلّی میں بڑے خاندانی اور برادریوں کے مندر ہیں۔ قبیلہ، قبیلہ اور برادری، برادری خاندان، خاندان کا بُت جُدا، جُدا ہے۔ جو مسلمان ان بتوں کو توڑ کر اسلامیت کے دائرہ میں داخل ہونا چاہے۔ خاندانی لات و عزیٰ کے پجاریوں کے نزدیک۔ کافر و زندیق ہے یہاں برادری اور خاندانوں کی اطاعت فرض ہے۔ یوں یہاں توحید کے وعظ سنو تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ مقام سرمدی سے خاندانی اور برادری کا واعظ بول رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ عصبیت جاہلیہ کے بندے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر اسلام ماتم کر رہا ہے۔ شریعت آنسو بہا رہی ہے۔ "دین" غم زدہ ہے لیکن ان کی بلا سے، یہ خاندان اور برادریوں کے مندروں کے پجاری، نشۂ دنیا میں سرمست بے لگام گھوڑے کی طرح دوڑے جا رہے ہیں۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ۬ ۝ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۝[1]

ترجمہ :- وہ دھوکہ کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے دراصل وہ کسی کو دھوکہ نہیں دیتے مگر اپنے ہی آپ کو۔ مگر احساس نہیں رکھتے۔ ان لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے۔ پھر اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھا دی۔ اور ان کے لئے دردناک عذاب اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے یعنی اسلام کا جھوٹا اظہار۔"

دِلّی میں کبھی خواجہ بختیار کاکیؒ اور خواجہ باقی باللہؒ حضرت نظام الدین اولیاؒ مرزا جانِ جاناںؒ، شاہ ولی اللہؒ اور ان کے صاحبزادوں کا روحانی سکہ چلتا تھا۔ یہ صدق و صفا کے روشن مینارے تھے۔ انھیں کی چشمِ خدا بیں سے دلوں کی اُجڑی

---

[1] سورۃ البقرہ پ۱

ہوئی بستیاں آباد ہو جاتی تھیں۔ دلوں پر لا الٰہ الا اللہ کی حکمرانی تھی۔ ہندوستان میں دین ان ہی کے دم سے پھیل رہا تھا۔ ان کی مجلسوں میں جو آیا وہ دل کو نورِ ایمان سے بھر کر لے گیا۔ اسی دلی کو خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رح اور شیخ مجدد سرہندی رح نے نوازا۔ مگر آج کیا ہے۔ الفاظ ہی الفاظ ہیں۔ جو اپنی حقیقت کھو چکے ہیں۔ ؎

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

تصوّف۔ تمدّن۔ شریعت۔ کلام — بُتانِ عجم کے پُجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبّت میں یکتا حمیّت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے (اقبالؔ)

عزیزہ زبیدہ۔! دلی کا حال تو تم نے سُن لیا۔ دلی کا معاشرہ مسلمان ہونے کے باوجود ذات پات میں پھنسا ہوا ہے۔ پھر کس بات کی رکاوٹ ہے۔ ہماری اور تمہاری راہ میں کوئی سنگِ گراں نہیں۔ ہم اور تم لا الٰہ الا اللہ کے نعرۂ توحید بلند کرنے والے ہیں۔ اور چشمۂ صافی کے کنارے بیٹھے ہیں۔ کیا تمہیں یقین نہیں کہ ایک مسلمان چشمۂ صافی پر پہونچکر کوثر و تسنیم کے جام پیتے ہوئے منزلِ مقصود پر آجاتا ہے۔ ہم یورپ کی بے اعتنا اور بے اعتماد دنیا میں پھلے اور پھولے نہیں ہیں۔ یورپ کیا ہے۔ جہاں زندگی ہے فقط آب و دانہ۔ ہم اس سے کہیں آگے ہیں۔ تم دیکھو ہماری اور تمہاری روحیں کس طرح گھُل مل گئی ہیں۔

من تن شدم تو جاں شدی — من جاں شدم تو تن شدی

تا کس نہ گوید بعد ازیں — مَن دیگرم تو دیگری

مجھے اُمید ہے کہ میں اور تمہاری آپا تمہاری تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق خوشی و مسرت سے تمہارا دامن پھولوں سے بھر دیں گے۔ لاہور والوں کو بھی لکھ دینا۔

یہاں قدم قدم ہران کا خیال ہے۔ بچوں کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ آپا کے غسل صحت سے بے حد خوشی ہوئی۔ کلثوم کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہے۔ بلال۔ رخسانہ۔ رضوانہ اور بانو اپنی باجی اور اپنے خالو جان کی خدمت میں سلام گزار ہیں۔ ہر بچے کو ہم یاد کرتے ہیں۔ ہماری طرف سے ہر ہر بچے کو پیار کرنا۔ پیار ہی نہیں بلکہ سب بچوں کو ہماری طرف سے دیدہ بوسی۔

ندیم تیرے حد یاد آتا ہے۔ ندیم کو اپنے انکل سے بے حد پیار تھا۔ ندیم کے انکل کو بھی ندیم سے بے حد محبت تھی۔ اور پیار تھا۔ زندگی دراصل پیار ہی کا دوسرا نام ہے۔

میں ندیم کو .K .U کا سرمد سمجھتا ہوں یہ قلندر زبان بے زبانی سے اشاروں ہی اشاروں میں بہت گہری باتیں کہہ گزرتا ہے۔ سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں چاہئیں۔ دوسرے کا درد وہی محسوس کرتا ہے۔ جس کے دل میں خود درد موجود ہو۔ سیم اور کلر۔ کی ماری ہوئی زمین کبھی فصل نہیں دیتی۔ جہاں نم ہو وہاں مٹی بہت زرخیز ہے۔ ساقی۔ سرمد نے ایک رباعی میں کہا ہے۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد — یک کار ازیں دو کار می باید کرد

ہو چکا بس شکوۂ لیل و نہار — کام دو ہیں کر کسی کو اختیار

یا تن بہ رضائے دوست می باید داد — یا جاں برہش نثار می باید کرد

یا سراپا بن رضائے دلربا — جان کر دے یا محبت میں نثار

ندیم نے جو آنسو گاڑی میں بہائے اور جس طرح رہ رہ کر مجھے یاد کیا اور جس والہانہ طریقے سے اپنے انکل کی طرف لوٹ جانا چاہتا تھا۔ محبت کے احساس کو وہی شخص جانتا ہے جس کو جوہر کی پہچان ہو۔ قدر زر زرگر بداند قدر جوہر جوہری۔

ندیم۔ پروین۔ عنبرین اور تم دونوں نگاہوں سے دور سہی، دلوں سے دور نہیں ہو۔

عزیزہ بانو خیریت سے ہیں۔ یاسر[1] گل سرسبد کی طرح ہنستا کھیلتا ہے۔ یاسر کی نانی جان کہتی ہے کہ جب یاسر آتا ہے تو غنچوں پر بہار آجاتی ہے۔ سلیمان اور بانو زندگی کی راہوں پر بے خطر چل رہے ہیں۔ اچھا ہے ہر روز روزِ عید ہو، ہر شب شب برات،

---

[1] میرا نواسہ یاسر ۱۲ نومبر کی شب کو ۱۱ بجے کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں آیا۔ میں نے اس کا نام منظم

زندگی کا سفینہ یونہی رواں دواں چلتا رہے۔

یہ تو میں نے سب کچھ لکھ دیا لیکن ابھی بھی بہت کچھ نہیں لکھا جو لکھنا چاہتا ہوں اُس پر قدغن لگی ہوئی ہے۔ قضا و قدر کے فرشتے اجازت نہیں دیتے۔ کہ میں دُنیا کا حال زار بیان کروں۔ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

یہ دُنیا کا مدوجزر طوفانوں کا پیش خیمہ ہے۔ خوب سمجھتا ہوں اور خوب جانتا ہوں کیا ہو رہا ہے کیا ہونے والا ہے اور کیا ہو چکا ہے۔

مجھے معلوم ہے کیا ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں (اقبالؔ)

عزیزم انور۔! اپنا چہرہ ذرا آگے بڑھاؤ تاکہ میں رُخِ انور کو چوم لوں اور زبیدہ کی دیدہ بوسی کروں۔ بچوں سے جذب و عالم کی مستی میں لپٹ جاؤں۔ کلثوم دعا لکھا رہی ہے۔ خط کچھ طویل ہو گیا ہے۔ جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

آپ چونکہ شعر کی زبان زیادہ پسند کرتے ہیں۔ خاص کر دلّی کے شعری مکتب خیال کی آپ ہمیشہ پُرجوش داد دیتے ہیں۔ اس لئے آپ کی خوشنودیٔ طبع کے لئے یہ شعر لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گا۔ ؎

محبت تری اس طرح دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

دُعا گو:۔
آپ کا بھائی

عزیز الرحمٰن۔ جامعی۔ لدھیانوی

مورخہ ۱۰ ؍ مارچ ۱۹۷۵ء

دیدۂ تر ـــــــــ !

"ایک عزیز کا ماتم ہو تو صبر آ جائے یہاں تو سینکڑوں عزیزوں کا غم ہے کس طرح صبر کروں"۔ غالب نے ۱۸۵۷ء میں یہ بات سچ ہی کہی تھی۔ میری کیفیت کو متمم بن نویرہ نے اپنے مرثیہ میں بیان کیا ہے۔ جو متمم نے اپنے بھائی کی یاد میں لکھا تھا۔ مرثیہ تو بہت طویل ہے۔ اس مرثیہ کے چند اشعار کا خلاصہ یہ ہے:

"میرے رفیق نے جب دیکھا کہ قبروں کو دیکھ کر میرے آنسو بہنے لگتے ہیں تو اُس نے مجھے ملامت کی۔ اُس نے کہا یہ کیا بات ہے تو اُس ایک قبر کی وجہ سے جو ایک خاص مقام پر واقع ہے ہر قبر کو دیکھ کر رونے لگتا ہے ـــ میں نے کہا بات یہ ہے کہ ایک کا غم دوسرے غم کی یاد تازہ کرتا ہے۔ لہذا مجھے رونے دے، میرے لئے تو سب قبریں مالک کی قبریں بن گئی ہیں۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ؛ دل، جگر تشنۂ فریاد آیا

دلی کی کہانی میں دیدۂ تر کا پہلا حصہ جو کتاب کے صفحہ ۳۱ پر ختم ہوتا ہے۔ میں نے عزیز انور کے نام ڈاک میں مارچ ۱۹۷۵ء کے پہلے ہفتہ میں "یو۔ کے" ارسال کر دیا تھا خط کا دوسرا حصہ جو آپ آئندہ صفحات میں پڑھیں گے۔ اِسے میں نے اپنے K - لما کے عزیزوں کے نام۔ ارسال نہیں کیا۔ "یہ غبار خاطر" کے خطوط کی طرح اشاعت پذیر ہے۔ میرے دل کی بیتابیاں صرف چند عزیزوں تک ہی محدود نہیں ہیں! میرے ہمدم و مونس دل کی ویرانی کا نہ پوچھ، یہ تو جرأت فریاد ہے جو کہ قلم بند ہو رہی ہے۔ تاکہ دل گم گشتہ کی حالت تاریخ کے صفحوں میں محفوظ ہو جائے۔

میری حالت قلعہ احمد نگر کے "نظر بند" سے زیادہ سقیم ہے قلعہ احمد نگر کا نظر بند اگر آج جامع مسجد کے سامنے آرام فرمانے کی بجائے زندہ ہوتا تو اُسے بھی میرے ساتھ متمم بن نویرہ کی طرح ماتم کرنا پڑتا۔ اگرچہ دلی میں ہوں لیکن دل غم و آلام کے سمندر میں غوطہ زن ہے۔ دلی میں پارلیمنٹ کی کارروائی آپ پڑھیں گے تو آپ محسوس کریں گے۔ کہ زخم کہاں لگے اور کتنے کاری اور گہرے ہیں۔ لیکن طبیب حاذق نے "ایک ہزار سے پانچ ہزار روپے تک کا عطیہ دیکر" زخموں پر مرہم لگا دی ہے۔ "قربانیاں اور ایثار اس الزام اور اتہام کو اپنے ذمہ لینے کو تیار نہیں ہے"۔

کاش کے "دلی کے دیدۂ تر" کو دیکھنے والی آنکھیں ہوتیں اور محسوس کرنیوالا دل ہوتا ـــ پارلیمنٹ کی بحث صرف دلی کی کہانی نہیں بلکہ سارے ہندوستان کی کہانی ہے۔ مسند تخت پر جو لوگ بیٹھے ہیں انھیں اس کی کیا پرواہ کہ یہ لوگ ہندوستان اور دلی کی عظمت رفتہ کو بے پروائی اور بے نیازی سے داغ لگا رہے ہیں۔ دلی کی کہانی کے حصہ دوم کی تاریخی دستاویز "دلی دردمند" لگ رہی ہے! مجھے رونے دو کیونکہ یہاں کی ہر قبر مجھے مالک کی قبر نظر آ

دِلّی کی کہانی

ممبرانِ پارلیمنٹ کی زبانی

حصہ دوم

آئے ہے "بیکسیٔ النساں" پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

۲ر فروری ۱۹۷۵ء

انتساب حصّہ دوم

ہندوستان

کی

مَلکہ نورجہاں محترمہ اندرا گاندھی

وزیراعظم ہند کے

نام

دِلّی کی کہانی ۔ حصّہ دوم

کا

انتسابُ

ذیل کے اشعار کے ساتھ کرتا ہوں کیونکہ اندرا جی ۲؍فروری سے ۲۷؍فروری تک خاموش رہیں

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا



وزیرِاعظم ہند

محترمہ اندرا گاندھی کے نام دلّی کی کہانی کے حصّہ دوم کا ان اشعار کے ساتھ انتساب کرتا ہوں ۲؍فروری ۱۹۷۵ء کے واقعہ پر ۲۸؍فروری ۷۵ء کو پارلیمنٹ میں بیان دیا۔ (ان واقعات سے ملک بدنام ہوا)

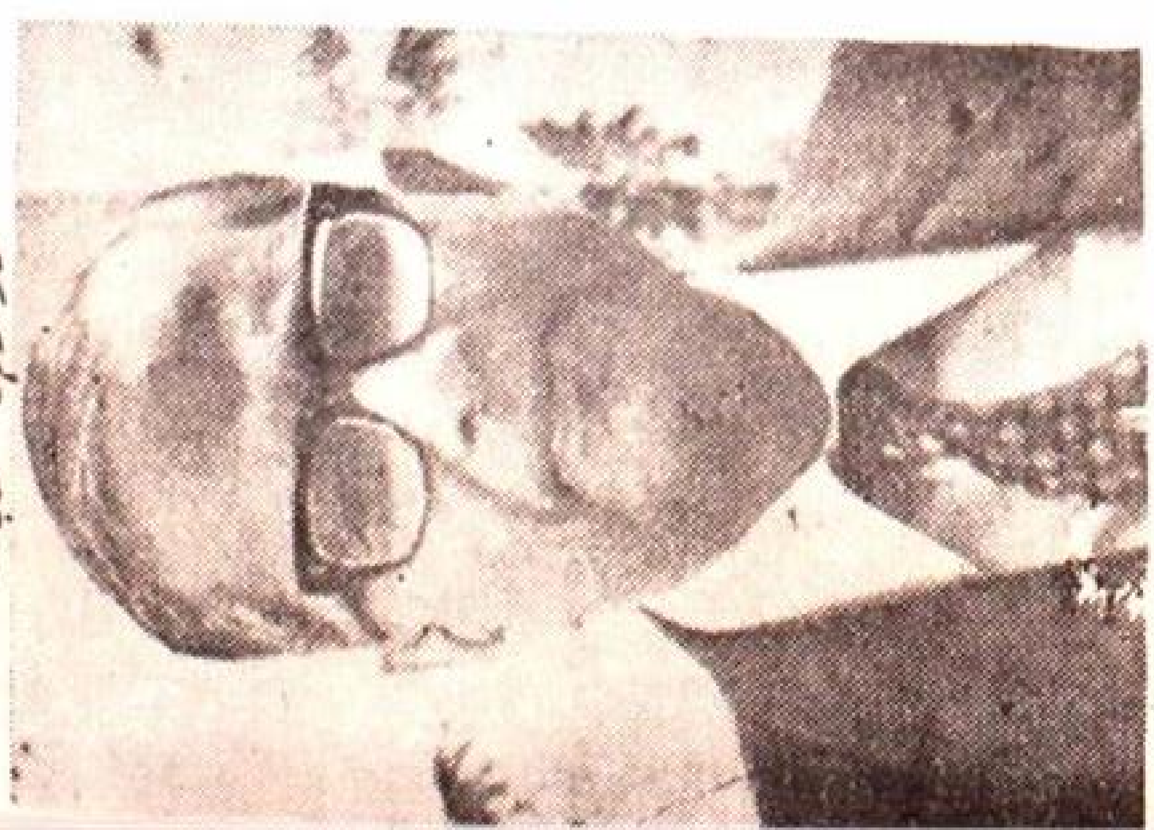
آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا

احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا مکاں اور زماں اور
(اقبال)



دلی کالج کی طالبہ
فریدہ



LIEUTENANT GOVERNOR
گورنر دہلی۔ کشن چند

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

عزیزم انور - سلام مسنون - دلّی کی کہانی کا دوسرا حصہ اب یہاں سے شروع ہوتا ہے -

۱۹ر فروری ۱۹۷۵ء کو پارلیمنٹ میں بحث کا آغاز

"کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد"

(غالب)

نئی دہلی - ۱۹ر فروری :- آج پارلیمنٹ میں مجموعی طور پر سات گھنٹہ تک جامع مسجد کے واقعات پر گرما گرم بحث ہوئی - پانچ گھنٹہ لوک سبھا میں اور دو گھنٹہ راجیہ سبھا میں - لوک سبھا میں اپوزیشن، وزیر داخلہ مسٹر برہمانند ریڈی کے بیان سے مطمئن نہیں ہوئی - اپوزیشن کے کچھ ممبران واک آوٹ کر گئے - اپوزیشن کے کچھ ممبروں نے الزامات در الزامات عائد کئے ایوان کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا - دونوں ایوانوں میں توجہ دلاؤ تحریکوں پر بحث ہوئی - لوک سبھا میں جامع مسجد کے واقعات پر بحث کا آغاز مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر مسٹر جیوتی مائی باسو نے کیا - انھوں نے پولیس پر زیادہ طاقت استعمال کرنے کا الزام لگایا - اور واقعات کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا - انھوں نے سید عبداللہ بخاری کی گرفتاری پر اعتراض کیا - مسٹر جیوتی مائی باسو نے وزیر داخلہ سے استعفےٰ کا مطالبہ کیا - مسلم لیگ کے مسٹر ابراہیم سلیمان سیٹھ نے کہا - کہ کرفیو کے سبب غریب آدمی پریشان ہے - انھوں نے پولیس کی زیادتیوں کی شکایت کی - جن سنگھ کے مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے کہا - کہ پولیس نے زیادہ طاقت استعمال کی ہے واقعات کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے - تاکہ سچائی سامنے آئے - اور کرفیو کے گرفتار شدگان کو فوراً رہا کیا جائے - تنظیمی کانگریس کے مسٹر ایس ایم مشرا نے بتایا کہ جامع مسجد کی دیواروں پر نشانات ہیں - پولیس نے اندھا دھند طاقت استعمال کی ہے - حکومت کو مسجدوں اور مندروں کے جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہیے - کانگریس کی ممبر مسز سبھدرا جوشی نے کہا - کہ افسوس کی بات ہے کہ اپوزیشن جامع مسجد کے مختلف واقعات کا سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے - کانگریس ہی کے مسٹر ہرکشن لال بھگت نے کہا - کہ اگر پولیس فوری کارروائی نہ کرتی - تو حالات پر قابو

نہ پایا جاسکتا تھا۔ پولیس نے حالات سے نپٹنے کے لئے صحیح طریقہ کار اختیار کیا۔ کرفیو لگانے سے ہی حالات پر قابو پایا جاسکتا تھا۔ انھوں نے بھی اپوزیشن پر حالات کا سیاسی فائدہ اٹھانے کا الزام لگایا۔ مسٹر ارجن سیٹھی نے کہا کہ سرکار پر الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ مولانا اسحٰق سنبھلی نے پولیس پر ظالمانہ انداز سے طاقت کے استعمال کا الزام لگایا۔ انھوں نے کہا کہ امامت کے سلسلہ میں وقف بورڈ کو مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔ پولیس کی زیادتی سے بے گناہ لوگ مارے گئے ہیں۔ انھوں نے تمام واقعات کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے۔ مسٹر شمیم احمد شمیم نے کہا۔ کہ واقعات جس ڈھنگ سے آگے بڑھے اس کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ مسٹر جنیشور پرشاد مشرا نے کہا کہ وقف بورڈ کو توڑ دیا جانا چاہیئے۔ مسٹر سمر گوہا نے کہا۔ کہ وقف بورڈ میں منتخب ممبر ہونے چاہئیں۔ مسٹر ایس۔ ایم۔ مشرا نے وقف بورڈ کی تنظیم نو کا مطالبہ کیا۔ مسٹر ایس۔ ایم بنرجی نے کہا۔ کہ طاقت کا غلط استعمال کیا گیا ہے۔ بحث کے آخر میں مرکزی وزیر داخلہ مسٹر برہمانند ریڈی نے بیان دیا۔ انھوں نے اپوزیشن سے اپیل کی۔ کہ وہ امن اور خیر سگالی کی فضا پیدا کرنے میں تعاون کرے۔ اپوزیشن صورت حال کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پولیس نے کافی برداشت سے کام لیا ہے۔ ہلاک شدگان اور زخمی ہونے والوں کے لئے ۸۸ ہزار روپے کی رقم منظور کی گئی ہے۔ حکومت آگ سے نقصان اٹھانے والوں کے مسئلے پر غور کر رہی ہے۔ وزیر داخلہ نے کہا۔ کہ حکومت قیام امن کی کوششوں کے سلسلہ میں اپوزیشن کے ساتھ بات چیت کے لئے تیار ہے۔ اس سے قبل جب توجہ دلاؤ تحریک پیش ہوئی۔ تو مولانا اسحٰق سنبھلی اور دوسرے کمیونسٹ ممبروں نے پوری بحث کا مطالبہ کیا۔ وزیر اعظم نے کہا۔ کہ معاملہ چونکہ اہم ہے اس لئے حکومت کو بحث پر اعتراض نہیں ہے۔ اس پر اسپیکر نے شام کو بحث کے لئے چار گھنٹہ کا وقت دیا۔ لیکن بحث پانچ گھنٹے جاری رہی۔

ہمارے نامہ نگار کی اطلاع کے مطابق آج جب مرکزی وزیر داخلہ نے اپنے بیان میں پولیس کی تعریف کی تو۔ مولانا اسحٰق سنبھلی نے چیخ کر کہا۔ کہ مسٹر ریڈی ہم آپ کو اس ایوان میں دلی کی قاتل پولیس کی تعریف نہیں کرنے دیں گے۔"

اس کے بعد اپوزیشن کے ممبروں نے زبردست شور و غل کیا۔ چیرمین کی طرف سے دو بار ریمارک دیئے گئے۔ ایک بار کہا گیا کہ اگر مولانا اسحٰق سنبھلی چیر پر ہوتے تو ان کو وزیر داخلہ کا بیان سننا پڑتا۔ کئی بار کوشش کی گئی کہ مولانا چیر سنبھالیں لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ اس شور و غل کے بعد اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ کیونکہ تمام اپوزیشن ایوان میں "دلی کی ظالم پولیس مُردہ باد" کا نعرہ لگاتے ہوئے واک آؤٹ کر گئی۔ بیشتر ممبروں نے اپنی تقریروں میں جامع مسجد کی دیواروں پر گولیوں کے نشانات کا تذکرہ کیا۔

(حوالہ الجمعیۃ اخبار ۲۱ر فروری ۱۹۷۵ء سہ روزہ ایڈیشن ص۴)

کمیونسٹ پارٹی (مارکسوادی) کے ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر میتھیو کرین نے کہا:۔

جناب نائب چیرمین صاحب ! مجھے حادثات کے بعد جامع مسجد کے علاقے میں جانے کا موقع ملا۔ میرے ہمراہ اس ایوان کے ممبر کامریڈ منورنجن رائے اور میری پارٹی کے چار لوک سبھا کے ممبر بھی تھے۔ ہم نے جائے واردات پر جاکر مختلف رپورٹوں کی چھان بین کی۔ اور مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں جھجک نہیں ہے کہ بد قسمتی سے مسٹر اوم مہتہ کا بیان پولیس کی من گھڑت قیاس آرائیوں اور جھوٹ کا ایک پلندہ ہے۔ جو ان کے پولیس حکام نے لکھ کر دیا ہے۔ بد قسمتی کی بات ہے کہ مسٹر اوم مہتہ اسی کو لے کر آگئے ہیں۔ جناب نائب چیرمین صاحب میں یہ کہوں گا کہ جامع مسجد کے علاقے میں جو کچھ ہوا وہ فرقہ وارانہ فساد نہ تھا۔ اس کا فرقہ واریت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس بات پر حکمراں پارٹی کے کچھ افراد کو چھوڑ کر سب ہی متفق ہیں۔ اس کے برعکس یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے حکمراں جماعت، دلی انتظامیہ اور پولیس کے غلط رویئے نے پیدا کیا ہے۔ جناب۔ ! حکمراں پارٹی، وقف بورڈ کو سیاسی سودے بازی اور سیاسی ہیرا پھیری کے لئے استعمال کرتی رہی ہے۔ یہ تمام جھگڑے کی بنیاد ہے۔ جب تک امام صاحب کانگریس کی حمایت کرتے رہے تب تک کوئی ہنگامہ نہیں ہوا لیکن جب انھوں نے کانگریس کے خلاف تقریریں کیں تو ہنگامہ بپا ہو گیا۔ جب امام صاحب کانگریس کی مدد کر رہے تھے۔

تو انھیں سوویت یونین (روس) بھیجا گیا۔ ان کے فیملی پلاننگ پر لکھے ہوئے پمفلٹ اور اشتہار چھاپے گئے اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ تقسیم کئے گئے۔ یہ سب کچھ حکمراں پارٹی اس وقت کرتی رہی جب تک وہ کانگریس کے حمایتی رہے۔

میں ۱۰ر فروری کے ہندوستان ٹائمز کا ایک اقتباس سناتا ہوں۔ نامہ نگار مسٹر آہوجہ کے مطابق امامت شاہجہاں کے زمانے سے آج تک باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ اماموں نے حاکمِ وقت کی ہمیشہ ہاں میں ملائی ہے لیکن موجودہ امام صاحب نے جمعہ کے خطبات میں حکومت پر نکتہ چینی کرنا شروع کردی۔ یہ جھگڑے کی اصل جڑ ہے۔ کہا گیا ہے کہ تنازعہ جائیداد سے متعلق معمولی سا تھا جو سرکار وقف بورڈ اور جامع مسجد کے امام کے بیچ تھا۔ جسے گولی چلانے میں خوشی محسوس کرنے والی دلّی پولیس اور دلّی انتظامیہ نے خون اور لوٹ کی ہولی میں بدل دیا۔ کرفیو نافذ کردیا گیا۔ بلا امتیاز لاٹھی چلائی گئی اور فائرنگ کی گئی۔ عوام کے خلاف سزا دینے کے جذبے سے پولیس نے کارروائی کی۔

میں پھر ۱۰ر فروری کے ہندوستان ٹائمز کا حوالہ دوں گا۔ اس میں لکھا ہے کہ موجودہ امام صاحب نے بہت سے مطالبے رکھے تھے۔ جن میں سے ایک یہ تھا کہ اسٹاف جیسے ۱۳۰/- روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ وقف بورڈ اس میں اضافہ کرے۔ اس کے علاوہ اور بھی جائز مطالبات تھے۔ ان مطالبات اور تنازعات کو سرکار نے حل کرنے کے بجائے وقف بورڈ کو سیاسی سودے بازی کے لئے استعمال کرنا شروع کردیا۔

پولیس اور پریس کی اطلاعات کے مطابق پولیس نے صرف ۲۶ راؤنڈ فائرنگ کی۔ جبکہ ہماری تحقیقات کے مطابق جامع مسجد کی دیوار پر ہی ۱۲ راؤنڈ کے نشانات موجود ہیں۔ فقیر محمد ایک طالب علم جو پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہوا۔ اس کے جسم پر سات گولیاں لگیں۔ یہ سب ۱۹ گولیاں ہوئیں اور اطلاعات کے مطابق ۲۲ سے ۲۵ افراد ہلاک ہوئے۔ کم از کم ۲۲ افراد کی لاشیں مُردہ گھر سے ملیں۔ اس لئے معزز منسٹر کا بیان غلط اور جھوٹا ہے کس طرح سات گولیاں ۲۲ سے لیکر ۲۵ افراد کو ہلاک کرسکتی ہیں۔ اس معاملہ پر تحقیقات کی ضرورت ہے۔

۲۴-۲۵ سالہ محمد نعیم کو جس کی شادی ۲۴ روز پہلے ہوئی تھی جھگڑے کی جگہ سے دو تین فرلانگ دور بڑی بے رحمی سے شوٹ کر دیا گیا۔ جامعہ ہوٹل میں جو لوگ پناہ لینے گئے تھے انھیں باہر سے بند کر کے سماج مخالف عناصر نے پولیس کی سازباز سے بھون دیا۔ میرے پاس اس کا ثبوت ہے۔ مِس فریدہ دہلی کالج کی بی۔اے کی طالبہ کو چار پولیس والوں کے گروہ نے درندگی کے ساتھ گولی ماردی۔ چار پولیس والے اس لڑکی کے مکان میں داخل ہوئے۔ اور بہت نزدیک سے گولی ماری۔ جناب ڈپٹی چیرمین صاحب! پولیس الماری میں سے ٹائم پیس اور ایک پرس جس میں ۲۳۰ روپے تھے، بھی چرا کر لے گئی۔ اور منسٹر یہاں یہ بیان دے رہے ہیں کہ لڑکی نے پولیس کو یہ بیان دیا ہے کہ وہ مارکیٹ میں زخمی ہوئی تھی۔ میں اس کے گھر گیا تھا۔ میں یہاں فریدہ کے خون سے بھری ہوئی چادر پیش کر رہا ہوں۔ یہ فریدہ کے خون سے بھرا ہوا کپڑا اس کے مکان کی سب سے اوپر کی منزل سے لیا گیا ہے۔ یہ وہ چادر ہے جس پر وہ گری تھی۔ میں اسے ثابت کرنے کو تیار ہوں۔ کامریڈ منورنجن رائے میری اس بات سے اتفاق کریں گے۔ ہم اس جگہ گئے تھے۔ ہم نے وہ بھی جگہ دیکھی جہاں حادثہ ہوا۔ یہ فریدہ کا خون ہے جو حکومت سے انصاف مانگ رہا ہے۔ شری اوم مہتہ کو اپنا سر شرم سے جھکا لینا چاہیئے کہ انھوں نے پولیس کے تیار کردہ جھوٹ کے پلندے کو ایوان میں دہرایا۔

اسی طرح ایک اور نزدیک کے مکان میں جس میں خواتین تھیں، جن کا ان معاملات سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا، پولیس دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئی۔ یہ اس دروازہ کا ٹکڑا ہے جسے پولیس نے توڑا۔ میرے پاس اس مکان کا نمبر ہے۔ میں اس کا نمبر نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ ان لوگوں کو خدشہ ہے کہ پولیس ان کو ہراساں اور پریشان کرے گی۔ اگر عدالتی تحقیقات ہوئی تو میں اس کا ثبوت فراہم کروں گا۔ پولیس نے مکان کا دروازہ توڑا، عورتوں کو ہراساں کیا، نوجوانوں اور بچوں کو گولیاں ماریں۔ یہ سب کچھ ہوا۔ پولیس لوٹ مار اور قتل و غارت گری میں لگی رہی۔ مجھے ایک دو باتیں اور کہنی ہیں:-

ہماری تحقیقات کے مطابق بیس دوکانیں نمبر ۶۱۷ سے لیکر نمبر ۶۳۸ تک ماسوائے ایک کے جلا دی گئیں۔ ایک دوکان اس لئے چھوڑ دی گئی کیونکہ پولیس اور غنڈے

اسے جلانا نہیں چاہتے تھے ۔ یہ بات غور طلب ہے کہ فائر انجن جوان دکانوں کے بہت نزدیک کھڑے رہتے ہیں آگ بجھانے کے لئے چالیس منٹ بعد آئے ۔ اس کے بعد جب کرفیو لگا دیا ۔ تو پولیس اور غنڈوں نے دو کانوں کی لوٹ مار کی ۔ اس سے تقریباً سات لاکھ کا نقصان ہوا ۔ اب میں کچھ شیطانوں کے نام بتاؤں گا ۔ مامن سنگھ چاندنی محل تھانے کا ایس ۔ ایچ ۔ او ۔ پولیس آفیسر مامن سنگھ اس جرم کا سرغنہ تھا ۔ اسی نے غنڈوں اور پولیس کی رہبری کی ۔ میں کچھ غنڈوں کے نام بھی پیش کر سکتا ہوں ۔ اشوک عرف پولا جو چاوڑی بازار میں کوچہ میر عاشق میں رہتا ہے ۔ میں آپ کے سامنے اور بہت سے غنڈوں کے نام پیش کر سکتا ہوں جو لوٹ مار اور آتش زنی میں مدد کر رہے تھے ۔ اور کرفیو کے اوقات میں بھی یہ غنڈے پولیس کے ساتھ آزادی سے گھوم رہے تھے ۔ میں یہ جاننا چاہوں گا کیا یہ سچ ہے ؟ اب کیا کیا جائے ۔ ؟ میں منسٹر سے مانگ کرتا ہوں کہ فوری عدالتی تحقیقات ہو ۔ عدالتی تحقیقات کے بنا سچائی سامنے نہیں آئے گی ۔ آپ اپنے اس بیان سے معاملات کو دفن نہیں کر سکتے ۔ یہ دبائے نہیں جا سکتے ۔ یہ آپ کی گردن پر سوار ہو جائیں گے ۔ آپ کو ہر حال میں سچائی کو سامنے لانا پڑیگا ۔ ہلاک ہوئے لوگوں کے ورثا مجروحین اور جن کی دوکانیں پولیس اور غنڈوں نے لوٹیں اور جلا دیں ، کو مکمل معاوضہ دیا جائے ۔ کرفیو فوراً اٹھا یا جائے ۔ جب تک ان باتوں کو نہ کیا جائے گا ، اور جب تک کانگریس پارٹی اپنے پنجوں سے وقف اور اقلیتی اداروں کو آزاد نہیں کرے گی ، تب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا ۔ میں یہ جاننا چاہوں گا کہ کیا منسٹر ان باتوں کے لئے تیار ہیں ؟ کیا وہ ان شہادتوں کی روشنی میں جو میں نے پیش کی ہیں جو ان کے پیشرو کے بیان سے بالکل متضاد ہیں ، عدالتی تحقیقات کرائیں گے ۔ اگر عدالتی تحقیقات ہوئی تو سچائی سامنے آجائے گی ۔ ہم اس تحقیقات کی مدد کریں گے ۔

تقریر جو کمیونسٹ پارٹی (مارکس وادی) کے کامریڈ جیوتر موئے باسو نے لوک سبھا میں ۱۹ فروری ۱۹۷۵ء کو کی ۔

کامریڈ جیوتر موئے باسو نے کہا :۔

" اب ہم جامع مسجد کے علاقے میں پولیس کے نہ تھمنے والے مظالم پر بحث کریں گے ۔

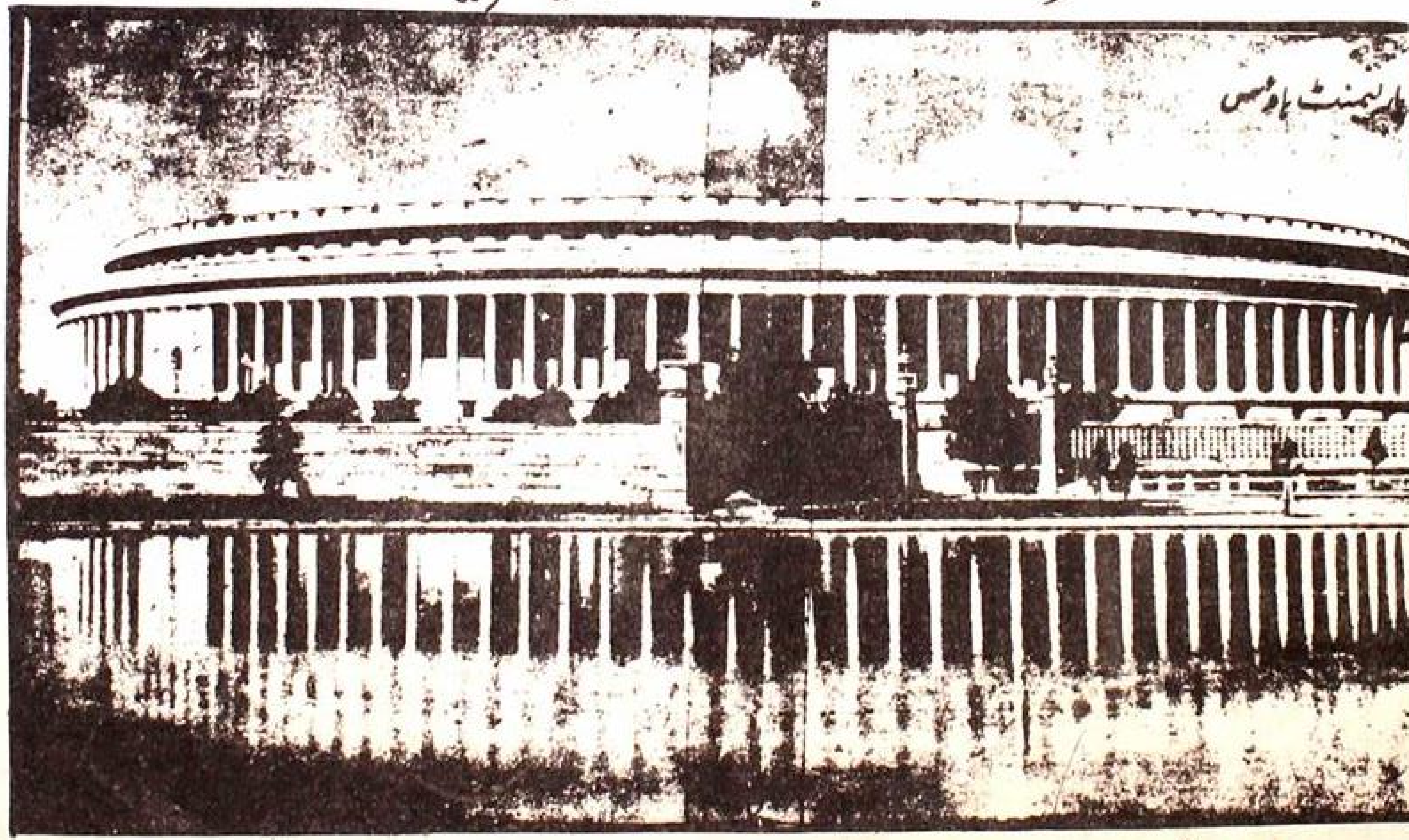
پارلیمنٹ میں

جامع مسجد کے حادثات پر ۲۰ / تا ۲۷ / فروری ۱۹۷۵ء
کو حصّہ لینے والے ممبرانِ پارلیمنٹ

کامریڈ میتھیو کرین - سی پی ایم	جیوتر موئے باسو - سی پی ایم
اٹل بہاری باجپئی - جن سنگھ	ابراہیم سلیمان سیٹھ - مسلم لیگ
یونس سلیم - کانگریس	جگدیش ماتھر - جن سنگھ
زیڈ احمد - سی پی آئی	جے نرائن - سوشلسٹ
شمیم احمد شمیم - ممبر پارلیمنٹ کشمیر	سبھدرا جوشی - کانگریس
سیّد احمد ہاشمی - جمعیت	ایس - ایم - بنرجی - سی پی آئی
اسحاق سنبھلی - سی پی آئی	خورشید عالم خاں - کانگریس

یہ طوفانوں پہ کرسکتے ہیں لچّھے دار تقریریں
دکھا سکتے ہیں تقریروں میں طوفانوں کی تصویریں
ہوا کا رُخ ذرا بدلے تو سب کچھ جان جاتے ہیں
تہہ دریا نہنگوں کی اجل پہچان جاتے ہیں
انھیں معلوم ہے گرداب نے کشتی کو گھیرا ہے

خشک مغز و خشک تار و خشک پوست   از کجا آید کہ ایں آوازِ دوست



بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل   جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

جن کے نتیجے کے طور پر بہت سے لوگ جو اقلیت سے تعلق رکھتے تھے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اور اب وہاں روزمرہ کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ جامع مسجد کو شہنشاہ شاہجہاں نے تعمیر کروایا۔ آج یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ پولیس نے اقلیتوں کی عبادت گاہ اور ایک تاریخی عمارت کو بھی نہیں بخشا۔ کیونکہ اس کی دیواروں پر ۱۲ جگہ گولیوں کے نشان ہیں جنہوں نے اس کی عمارت کو نقصان پہونچایا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کیونکہ میں وہاں گیا۔ میں نے ان کو باری باری گنا ہے۔ یہ اس لئے ہوا کہ سرکار اور اس علاقے کے لوگوں کے بیچ جھگڑا تھا جو بدقسمتی سے اس ملک کی اقلیت ہیں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، کوئی سیاسی پارٹی یا سیاسی لیڈر اس سے وابستہ نہیں تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شری ریڈی کیا کہتے ہیں۔ ؟ اور کس کے اوپر الزام تھوپتے ہیں۔ یہ ایک بھیانک حادثہ ہے۔ ایک سنگین جرم ہے جس میں ۲۵ لوگ جنونی پولیس کی گولیوں کا شکار ہوئے۔ جن کی رہنمائی خاص طور سے اسٹیشن ہاؤس آفیسر من۔ جس کو بوچڑ کہنا مناسب ہوگا، کر رہا تھا۔ ایک سال کے اندر راجدھانی میں دو مرتبہ اقلیتوں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا۔ دس ماہ گزر گئے ہیں۔ شری ریڈی! صدر بازار کے فسادات کی رپورٹ کا کیا ہوا۔ ؟ ملک کو اس (رپورٹ) کو ملنے کا حق ہے۔

بین الاقوامی سطح پر اس کا کیا ردِّعمل ہوا خاص طور پر مسلم ممالک اور عرب ممالک پر جن سے ہم مختلف دائروں میں اقتصادی دوستی اور رعایتیں چاہ رہے ہیں۔ ؟ اس علاقے میں رہنے والے لوگ غیر ملکی نازیوں کے تحت یہودیوں کے لوگوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔

پولیس کی گولیوں نے مسجد کو نہیں بخشا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ۱۲ نشانات دیکھے۔ پولیس خوش ہو کر کہتی ہے۔ کہ ہم نے صرف ۲۶ راؤنڈ چلائے۔ ایک مہذب ملک میں، ایک جمہوریت میں، اس برصغیر کی راجدھانی میں دن دہاڑے گولیوں کے ۲۶ راؤنڈ ۳۰۳ رائفل سے چلائے گئے۔ ہو سکتا ہے کہ اور طرح کے ہتھیار استعمال کئے گئے ہوں۔ کیا یہ ایسی بات نہیں جس پر آپ کا (سرکار کا) سر شرم سے نہیں جھک جانا چاہیئے۔ ہم نے سنا ہے کہ لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں۔ اب ہم سن رہے ہیں کہ لوگ پولیس کی گولیوں سے موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ اس طرح کی حکومت ہم پر مسلّط ہے۔

ایک کمسن اسکول کا لڑکا، ایک بہار اسلمان لڑکا ہلاک ہوا جس کے جسم پر کم سے کم سات گولیوں کے نشان تھے۔ کتنے شرم کی بات ہے! میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ جب میرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے کہ اسکول کا لڑکا، ایک کمسن سات گولیوں کی تاب نہ لاکر چل بسا۔

شری ریڈی! ۱۷۰ کروڑ روپے کے بجٹ کا مصرف کیا ایک کمسن کو ہلاک کرنا ہی اس کے جسم پر سات گولیوں کے زخموں کے نشان ہیں۔ کیا آپ اسی قابل ہیں؟ پولیس لگاتار سفید جھوٹ اُگل رہی ہے ــــ وہ کہتے ہیں کہ ہجوم نے پولیس چوکی کو آگ لگائی ــــ ہم نے پولیس چوکی جو کی ہے۔ وہاں آگ کا کوئی نشان نہیں۔

ایک چشم دید گواہ نے مجھے بتایا کہ اسٹیشن ہاؤس آفیسر چلا چلا کر منسلک علاقے سے لوگوں کو اپنی مدد کے لئے بلا رہا تھا۔ اور اس طرح اس کو غنڈوں کی مدد ملی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے ۲۵ روپے کی دو کانوں کو آگ لگائی جو مسجد کی دیوار کے ساتھ ہیں۔ ۶۱۷ نمبر سے ۶۳۸ نمبر تک دو کانوں کو کچھ پولیس والوں اور غنڈوں نے جلا کر راکھ کر دیا۔ کیا مسلمان مسجد کی دیواریں آگ لگائیں گے ــــ یہ کبھی انھوں نے نہیں کیا۔ اوزاروں کی چالیس دو کانیں لوٹی گئیں اور وہ بھی کرفیو کے دوران! سب سے پہلے ضروری بات یہ ہے کہ اس اسٹیشن ہاؤس آفیسر کی شکل میں شیطان کو فوراً گرفتار کیا جائے اور اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ تاکہ اس ملک کے پولیس والوں کو معلوم ہو کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔ جو عہدہ دار ہوں اور وہ غلطی کریں ان کو زیادہ سزا ملنی چاہیئے۔ یہ قانون دنیا کے کئی ملکوں میں رائج ہے۔

جناب اعلیٰ اگر آپ جامعہ ہوٹل جائیں ــــ یہ ایک نہایت سنگین معاملہ ہے۔ چھ لوگ زندہ بھون دیئے گئے۔ ایک ہوٹل کو دن کے ڈھائی بجے پھونک دیا گیا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہوٹل کو کس بُری طرح جلایا گیا ہے۔ مجھے علاقے کے لوگوں نے اعتماد میں لیکر بتایا ہے کہ ہم نے آگ بجھانے کی کوشش کی اور پانی کی بالٹیاں بھی لائے مگر پولیس والوں نے آگ بجھانے سے ہمیں روکا۔ آپ حویلی اعظم خاں میں جائیں۔ ہر طرف سوگوار چہرے اور آنسو نظر آئیں گے۔ ایک نہیں آٹھ لوگوں کو شوٹ کیا گیا۔ آپ جتنی قبر میں جا کر مرحوم

شجاع الدین کے کُنبے سے ملنے ایک لڑکی پر گولی چلائی گئی۔ اس کا باپ اس خبر کی تاب نہ لاکر چل بسا۔ کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے؟ کیا ہم سے ناک کے راستے پیسہ بجبٹ کے لئے اس لئے وصول کیا جارہا ہے۔ کہ پولیس کے فرائض ادا ہونے کے بجائے ان خبیثوں کی پرورش ہو۔ پولیس دوسری منزل پر چڑھ گئی۔ اور اس نے فریدہ کے سر پر سوار ہو کر گولی داغ دی جو اس وقت سلائی کر رہی تھی۔ میں اپنے ساتھ اس کا خون میں ڈوبا ہوا کپڑا لایا ہوں۔ تری ریڈی! اس کو آپ خود دیکھ سکتے ہیں اور بتائیں کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔ وہ بیٹھی ہوئی سلائی کر رہی تھی۔ (لوک سبھا میں کانگریسیوں کی طرف سے شور) مجھے شرم آتی ہے کہ جب ہم ایک دل ہلا دینے والے واقعہ کا ذکر کر رہے ہیں جس کی وجہ سے ہم سب کا سر مہذب دنیا کے سامنے شرم سے جھک جانا چاہیئے۔ ہمارے (کانگریسی) دوست رکیک جملے بازیاں کر رہے ہیں۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں۔ اگر آپ ثابت کر دیں کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ تو میں ہر سزا برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں جو یہ ایوان مجھے دے۔

امام صاحب کو میسا کے تحت گرفتار کیا گیا۔ سبب کیا تھا۔؟ غداری؟ ان کو جیل میں کونسے درجے میں رکھا گیا؟ تیسرا درجہ (سی کلاس) ہندوستان کی جامع مسجد کا امام جیسے تیسرے درجے کا قیدی بنا کر مجرموں، جیب کتروں، چوروں، نقب لگانے والوں اور شاید نجّوں کے ساتھ رکھا گیا۔ ان پر یہ الزام ہے کہ انھوں نے سرکار کے خلاف تقریریں کیں۔ میں ان لوگوں کے سامنے جو پرانے کانگریسی ہیں یہ بات رکھنا چاہتا ہوں۔ کیا ماضی میں انھوں نے کانگریس سرکار کے حق میں تقریریں نہیں کیں؟ کیا بارہا وہ سرکار کی طرف سے بیرونی ممالک نہیں بھیجے گئے؟ سرکار کی غلطیوں کی وجہ سے وہ سرکار کے خلاف ہو گئے ہیں۔ اس لئے سرکار نے انھیں سبق دینے کا فیصلہ کیا اور اس جگہ سے ہٹا دیا۔

سُنّی قاعدے کے مطابق عوام امام کو چُنتے ہیں اور انھیں کی مرضی کے مطابق وہ اس جگہ پر ہوتا ہے۔ امام کی رسم امامت میں میر مشتاق احمد موجود تھے (جو میٹروپالیٹن کونسل کے چیرمین اور کانگریس کے سرکردہ لیڈر ہیں) سُنّی قانون کے مطابق عوام کی رائے ہی

سب سے بڑا پیمانہ ہے ۔ میں یہاں عبدالرحمٰن کی مشہور کتاب جو مُسلم قانون پر ہے ۔اس کا حوالہ دوں گا۔

"امام لوگوں کا نمائندہ ہوتا ہے اور اسی رشتے سے وہ اپنے حقوق اور امتیازی حیثیت حاصل کرتا ہے۔ امام کا عہدہ اجماع پر چُنے جانے والا عہدہ ہوتا ہے یعنی لوگوں کی مرضی۔ اور اس کی پہلی مثال پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کا الیکشن کے ذریعہ خلیفہ ہونا تھا۔"

امام مُسلم قانون کی رُو سے جس میں جمہوری اور برابری کی روایات ہیں۔ ایک چُنا ہوا شخص ہوتا ہے نہ کہ تقرر کیا ہوا۔

اس تنازع میں لوگ شریمتی اندرا گاندھی کی سرکار سے لڑے۔ سرکار چاہتی تھی کہ وہ جُھک جائیں اور گھٹنوں کے بل چل کر سرکار کے حضور میں پیش ہو جائیں۔ اس وجہ سے جامع مسجد میں اقتصادی حربے کی شکل میں اور ان کو بلیک میل کرنے کے لئے تمام علاقے میں جہاں غریب لوگ، چھوٹے سوداگر، دوکاندار، روزانہ مزدوری کرنے والے محنت کش اور پھیری والے رہتے ہیں۔ لگاتار کرفیو لگا یا گیا۔ کرفیو ٹھونسنے کا مقصد یہ تھا کہ ایک انسان اپنی روزی نہ کما سکے۔ اور بھوک سے بدحال ہو۔

اب فرقہ وارانہ فسادات پر نظر ڈالی جائے تو تصویر سامنے آتی ہے۔ سرکار کے مہیّا کئے ہوئے اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۷۲ء میں ۲۴۰ فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور اقلیتوں کو نقصان اٹھانا پڑا لیکن ۱۹۷۳ء میں یہ اور بڑھ گئے۔ صرف سال کے ابتدائی چھ مہینوں میں جون تک فسادات کی تعداد ۲۴۲ ہو گئی۔ زیادہ بھیانک فسادات یو۔پی میں گونڈہ، میرٹھ اور الہ آباد میں۔ مدھیہ پردیش میں ناگپور میں۔ راجستھان میں ٹونک میں۔ مہاراشٹر میں بمبئی اور پونا میں۔ اور گجرات میں احمد آباد، مدراس میں اور دہلی میں ہوئے۔ یہ سب ہوم منسٹری کی رپورٹ کے مطابق ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ اس کو جھٹلائیں گے نہیں۔ وہ کرتے کیا ہیں؟ کہنے کے لئے بڑھ چڑھ کر باتیں ملائی جاتی ہیں۔ محترم! صدر بازار کے فسادات کو دس ماہ گذر گئے۔ مسٹر ریڈی کی وہ رپورٹ کہاں ہے۔ دس ماہ میں ایک حمل بنتا ہے اور ایک بچہ بھی رونما ہو جاتا ہے۔

کہاں ہے رپورٹ ؟ (کانگریسیوں کی طرف سے شور وغل)...... سرکار، پولیس اور قومی یکجہتی کونسل کا یہ رویہ ہے جس کے لئے یہ ایوان پیسہ منظور کرتا ہے ۔ کیا باتیں کرتے ہو ؟ یہ سب باتیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں منسٹر صاحب کا سینہ تانبہ کا ہے اور پیر گارے کے ۔"

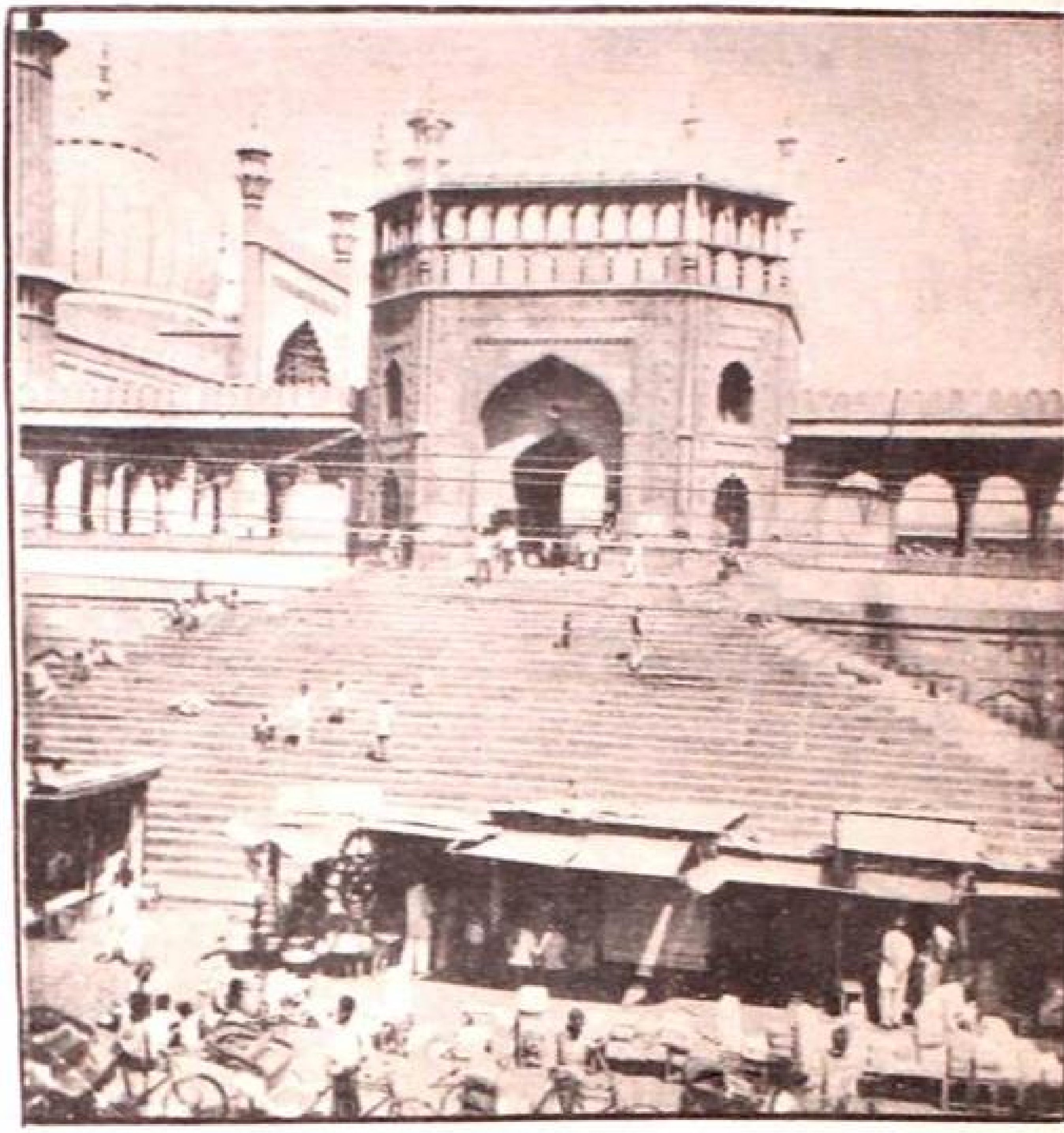
ڈپٹی اسپیکر نے بیچ میں کہا ۔ مگر دل سونے کا ہے ۔ جو ترموئے یا سموئے منہ توڑ جواب دیا :۔ "اسمگل شدہ سونے کا)

اب ذرا صدر بازار کے معاملات کی طرف آیئے ۔ فسادات دوپہر کے ڈیڑھ بجے ہوئے شام کے ۵ بجے سلیمان سیٹھ نے وزیر اعظم سے بات کی ۔ انھوں نے کہا کہ فوج کو بلایا گیا ہے ۔ جب ہم نے بعد میں مسٹر دکشت سے ملاقات کی اور بعد میں محترمہ سے ملے تو کہا گیا ۔ کہ بارڈر سیکورٹی فورس کو لانے کی کوشش کی جارہی ہے ۔ کیونکہ سی ۔ آر ۔ پی کچھ گھر بلو ہو چکی ہے ۔ اس لئے کام کے لائق نہیں لیکن انھیں پانچ گھنٹوں میں ۲۸ آدمی مارے گئے تین سو اشخاص زخمی ہوئے اور اقلیتوں کی ڈیڑھ کروڑ کی ملکیت برباد کی گئی مسلمانوں کی ساٹھ دوکانیں جلادی گئیں ۔ پانچ مسجدیں جلادی گئیں ۔ ۱۹۷۳ء میں ایک سال پہلے بھی ایسا واقعہ ہوا تھا ۔ بس مسٹر ریڈی آپ کو وزارت پر براجمان رہنے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ اگر آپ میں ذرا بھی غیرت ہے تو استعفٰی دیدیجئے ۔ میں تمام منسٹروں سے یہی بات کہہ رہا ہوں ۔ خاص طور پر ان منسٹروں سے جو اقلیتی فرقوں کے ہیں ۔ اگر وہ صرف وزارت کے بھوکے ہیں ۔ تو وہ اس کو چاٹتے رہیں اور اس سے چپٹے رہیں لیکن اگر وہ عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے انھیں یہاں بھیجا ہے ۔ تو انھیں استعفٰی دے کر نکل آنا چاہیئے ۔ تم یہ سب برداشت کرتے رہتے ہو تاکہ ایک لودم وزیر بنے رہو ۔ ایک کار کے لئے ، ایک بنگلے کے لئے اور چند سلاموں وغیرہ کے لئے ۔ تمہارے پاس کیا جواب ہیں ۔ ان لوگوں کو دینے کے لئے جو تمہیں سالہا سال سے چن رہے ہیں ۔ ؟ دلی میں ۱۹۷۳ء میں فساد ہوا ۔ ۱۹۷۴ء میں فساد ہوا ۔ ۱۹۷۵ء میں پولیس گولیاں دندنا رہی ہے ۔ یہ ہے صورت حال مسٹر ریڈی ! مگر سرکار کے سر پر جوں نہیں رینگتی ۔ آپ دیکھئے

قومی یک جہتی کونسل کو، کتنے گونج پیدا کرنے والے نام اس کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی، ایشیا کا ابھرتا ہوا سورج، اس کی سربراہ کہی جاتی ہیں۔ اس قومی یک جہتی کونسل کی ۱۹۶۸ء کے بعد میٹنگ بلانے کی تکلیف ہی گوارا نہیں کی گئی۔ اور کون کون سے ریزولیوشن پاس کئے گئے تھے۔؟ کیا کارروائی کی گئی۔؟ ریزولیوشن بہت متبرک ہیں۔ میں تمام چیزوں پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ تم لوگوں نے کیا کیا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں قومی یک جہتی کونسل نے ایک ریزولیوشن پاس کیا تھا جس کے مطابق یہ طے کیا گیا تھا کہ ضلعوں اور ریاستی سطحوں پر شہریوں کی کونسلیں قائم کی جائینگی۔ میں مغربی بنگال کی مثال دیتا ہوں (ان کی طرف سے) ہوم منسٹر کی مشاورتی کمیٹی کو جواب بھیجا گیا۔ کہ "معاملے پر سرکار توجہ دے رہی"۔ چھ سال کے بعد ریزولیوشن کی یہ درگت بنی۔ اقلیتوں کے کمیشن کا کیا ہوا۔؟ مالی بہتری، تعلیم، پولیس اور دفاع اور ملازمتوں کے دائروں میں حالات ان کے لئے جوں کے توں ہیں۔

...... میں کلکتہ سے ہوتا ہوا آرہا ہوں۔ لندن میں ایک سیمینار ہوا تھا جس میں مسلم دنیا کے روشن خیال لوگوں نے شرکت کی تھی۔ وہاں پر اعداد و شمار کے ذریعے اس بات کو بتلایا گیا۔ کہ ہندوستان میں اہم عہدوں پر اقلیتوں کو نہ ہونے کے برابر نمایندگی حاصل ہے میرے پاس وہ اعداد و شمار موجود ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ اونچی تعلیم حاصل کرنے والے میں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ اعداد و شمار مجھے غیاث الدین محمد صاحب نے فراہم کئے تھے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں۔ کہ ایم۔ ایس۔ سی فائنل میں ۱۸ طالب علم ہیں مسلمان کوئی نہیں۔ ۲۸ سال گذر چکے ہیں۔ اقلیتوں کے سلسلے میں جن کے بارے میں بہت شور مچایا جاتا ہے کیا کیا گیا۔ وہ جب حفاظت چاہتے ہیں تو کم از کم اتنا تو ہونا چاہیئے کہ پولیس انھیں شوٹ نہ کرے۔

میں آخر میں یہ کہہ کر اپنی بات ختم کرنا چاہتا ہوں کہ عدالتی جانچ لازمی ہے۔ تمام متاثرہ لوگوں کو مکمل معاوضہ دیا جائے۔ مجرم پولیس والوں کو اور خاص طور سے اسٹیشن ہاؤس آفیسر پر فوراً مقدمہ چلایا جائے۔ جن لوگوں کی دوکانیں جلائی اور لوٹی گئی ہیں۔



۲ فروری ۱۹۷۵ء کو جامع مسجد کے اندر باہر اور مٹیا محل بازار سے لے کر چتلی قبر کے چوراہے کے آس پاس گلیوں میں نوجوان پولیس کی گولیوں سے شہید ہو گئے۔ اور پھر تین دن تک کے لئے کرفیو لگ گیا —— پھر ۹۶ گھنٹے کا کرفیو لگا۔ تین دن بعد کرفیو میں ڈھیل دے دی گئی۔ سارے قدیم شہر میں ہو کا عالم تھا۔ ہندو مسلمان سب گھروں میں نظر بند تھے۔ جامع مسجد کے حادثہ میں عوام اور حکومت فریق تھی۔ لیکن سارے المیہ میں ہندو مسلم اتحاد کا پہلی دفعہ زبردست مظاہرہ کیا گیا سارے شہر میں یہ عالم تھا کہ ؎

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں



امامت اور اوقاف کا جھگڑا چند خود غرضوں نے پیدا کیا

جامع مسجد کے شاہی امام سید عبداللہ بخاری کا حقیقت آمیز بیان

اگر مسلمان پسماندہ ہیں تو ملک کی تمام قومیں ان کی پسماندگی کی تکالیف سے بچ نہیں سکتیں۔

آج جب ہم میں اتحاد ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمارے مسائل حل نہ ہوں اگر ہمارا اتحاد قائم رہا تو ہمارے مسائل ضرور حل ہوں گے ہمارے اتحاد میں ہماری عزت و عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ آج اصل مسئلہ جامع مسجد کی امامت کا یا وقف بورڈ کا نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ ملت کے ان بنیادی حقوق کا ہے جن سے ۴۰ سال سے ہماری ملت محروم ہے۔ ہم پُرامن ذرائع سے اپنے بنیادی حقوق کی جدوجہد کرتے رہیں گے اور تشدد کے راستہ پر ہرگز گامزن نہ ہوا جائے۔

ایک مقامی جریدہ نے لکھا کہ میں معافی مانگ آیا ہوں میں بتا دینا چاہتا ہوں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے پہلے مسلم لیگ میں کوشش کی لیکن وہاں ان کے حسب منشا مقام نہ ملا تو کانگریس میں شامل ہوئے میں ان کو چیلنج کرتا ہوں اگر ان کے پاس میرے معافی نامہ کی کوئی تحریر ہے تو عوام کی عدالت میں پیش کریں میں نے کوئی بھی ایسی تحریر نہیں دی ہے۔

چند خود غرض لوگوں نے میری گرفتاری کے بعد امامت اور وقف بورڈ کا جھگڑا کھڑا کر دیا تھا میری نظر میں ملت کے بنیادی حقوق کے مقابلہ میں اس مسئلہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اب ہمیں گامزن ہونا ہے اپنی اس منزلِ حیات کے لئے جس کی خاطر ملت نے قربانیاں دی ہیں اور وہ منزل ہے بنیادی حقوق کا حصول۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

(اقبال)

ان کو معاوضہ دینا لازمی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اور وزیر اعظم جانتی ہیں کہ انھوں نے کہا تھا کہ وہ فساد زدہ لوگوں کے لئے بیمہ اسکیم لاگو کرنے پر سوچیں گی۔ اس لئے اس کیس میں ہم چاہیں گے کہ سرکار رقم دے۔ میں یہ بھی جاننا چاہوں گا۔ کہ بیمہ اسکیم کو پایۂ تکمیل تک کیوں پہونچایا نہیں گیا۔

پس ہم مانگ کرتے ہیں کہ عدالتی جانچ ہو۔ اور تمام متاثرین کو مکمل معاوضہ دیا جائے۔ اور رامن سنگھ پر فوراً مقدمہ چلایا جائے۔

(منقول کتابچہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی مارکس وادی۔ نئی دلی)

اٹل بہاری باجپئی نے کہا:۔

کل اس ایوان میں ۲ ر فروری۔ کے المناک حادثے پر مذاکرات ہوئے تھے۔ آج یہ ایوان ۲ فروری کے حادثے پر بحث کر رہا ہے۔ جو کچھ اس دن جامع مسجد کے علاقے میں ہوا اس کی عدالتی جانچ ہونی چاہیئے۔ اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں۔ پولیس نے گولی چلائی۔ اس وقت موقع پر دس آدمی ہلاک ہوئے۔ کیا گولی چلانا ضروری تھا؟ کیا بغیر گولی چلائے حالات پر قابو نہیں حاصل کیا جا سکتا تھا؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ سرکار پہلے سے خبردار تھی جیسا کہ کہا جا رہا ہے۔ سبھدرا جوشی جی نے کہا ہے۔ کہ امام صاحب پہلے ہی ایسے لوگوں میں گھر گئے تھے۔ ایسے لوگوں کے ذریعہ انھیں بہکا دیا گیا تھا۔ اور ان کے بہکائے میں آکر وہ اشتعال انگیز تقریریں کر رہے تھے تو پھر ان کے خلاف پہلے سے کوئی کارروائی کیوں نہیں کی گئی۔ جب معلوم تھا کہ وقف بورڈ کی جہاں نشست ہو رہی ہے۔ دریا گنج میں۔ وہاں کچھ لوگ مظاہرہ کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ اور امام صاحب نے اعلان کیا تھا۔ کہ میں وہاں جاؤں گا۔ اور اگر جنرل شاہنواز خاں مجھے گولی سے اڑانا چاہتے ہیں تو اڑا دیں۔

اس پر شاہنواز خاں نے مداخلت کرتے ہوئے فرمایا "میں نے ایسا کبھی نہیں کہا" شری انیس۔ اے۔ شمیم نے جملہ پھینکا "آپ فوجی آدمی ہیں۔ آپ آزاد ہند فوج

میں رہ چکے ہیں۔ آپ کا تو کام ہی یہی ہے۔"

شری اٹل بہاری باجپئی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"آپ یہ مانیں گے کہ امام صاحب نے یہ کہا تھا۔ اور آپ بھی کہتے ہیں کہ پولیس کو پتہ تھا کہ مظاہرہ ہونے والا ہے۔ وہاں پر جہاں پر دریا گنج میں وقف بورڈ کی میٹنگ ہو رہی تھی تو کیا میں جان سکتا تھا کہ مظاہرین کے ساتھ پولیس نہیں تھی۔؟ کہا جاتا ہے کہ مظاہرین جہاں بیٹھک ہو رہی تھی وہاں زبردستی گھس گئے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ کتنے مظاہرین تھے؟ کیا انھیں پولیس نہیں روک سکتی تھی؟ اس دن پولیس کا انتظام مکمل کیوں نہیں تھا؟ جنرل شاہنواز خاں سے پریس کانفرنس میں پوچھا گیا تھا کہ امام صاحب کو پہلے کیوں نہیں پکڑا گیا۔ تو وہ کہنے لگے کہ یہ ذرا نازک معاملہ تھا۔

شاہنواز خاں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:"نازک اس لئے تھا کہ یہ کہا جاتا۔ کہ اقلیتوں کے اوپر ظلم کیا جا رہا ہے۔ اگر کسی مسلم ملک میں امام صاحب ایسا کرتے تو کیا وہ بچ سکتے تھے"؟

کسی معزز ممبر نے مداخلت کی ۔ "تو انھیں گولی سے اُڑا دیا جاتا"؟

شری جیوتر مائے بسو:"آپ لیٹرین میں چھپ گئے تھے"۔

شری شاہنواز خاں:۔ جب پتھر پھینکے جا رہے تھے تب بھی ہماری میٹنگ جاری رہی اور میٹنگ پوری کر کے ہم وہاں سے اٹھے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد اُٹھے۔

شری اٹل بہاری باجپئی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:۔ وہ شاہنواز صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ اس سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ بھلے ہی مظاہرہ ہو۔ مگر ان کی میٹنگ چلتی رہی۔ مظاہرین اندر گھس گئے۔ انھوں نے میٹنگ کرنے نہیں دی۔ اور جنرل صاحب جو کہہ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مظاہرین جتنے مشتعل بتائے جاتے ہیں وہ اتنے مشتعل نہیں تھے۔ بیٹھک چلتی رہی۔ فیصلے ہوتے رہے اور مظاہرہ اپنی جگہ موجود تھا۔ تو پھر حالت اتنی کیوں بگڑی کہ پولیس کو دس لوگوں کو گولی سے مارنا

پڑا۔؟ اس بارے میں معاملے کی جانچ ہونی چاہیئے۔

جنرل صاحب کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ اگر میں ہوتا تو امام کے گولی مار دیتا۔ اور امام صاحب کا کہنا ہے کہ یہ بات میرے پاس آئی اور اسی لئے میں وہاں گیا کہ اگر مجھے گولی مارنا ہے تو آپ مجھے ڈھونڈنے کہاں جائیں گے۔ میں موجود ہوں۔ مجھے ماریئے۔

شری شاہنواز خاں نے مخل ہوتے ہوئے کہا۔ انھوں نے مجھ سے کیوں نہیں پوچھا۔ کہ کیا آپ نے کہا ہے؟ (مداخلت) شری اٹل بہاری باجپئی نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کا فیصلہ کون کرے گا"؟ سارے معاملے کی جانچ ضروری ہے۔ پولیس نے جو طاقت استعمال کی وہ ضروری تھی؟ یہ کیسے طے ہوگا۔ سبھدرا جوشی کے الزامات میں کتنی سچائی ہے۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ دس لوگوں کا قتل عام غیر ضروری تھا۔ حالات کو قابو میں لایا جا سکتا تھا۔ مگر جن کے ہاتھ میں دِلّی کے انتظامیہ کی باگ ڈور ہے وہ جامع مسجد کے مسلمانوں کو ایک نصیحت دینا چاہتے تھے۔ ایک سبق سکھانا چاہتے تھے۔ کیا یہ امامت کا جھگڑا کل شروع ہوا ہے۔ یہ جھگڑا جولائی ۱۹۷۳ء سے چل رہا ہے۔ شریمتی سبھدرا جوشی کہاں ہیں؟ چلی گئیں؟ شریمتی سبھدرا جوشی کا اخبار نکلتا ہے۔ "سیکولر ڈیموکریسی" نہ اس کا سیکولرازم میں بھروسہ ہے اور نہ ڈیماکریسی میں، پتہ نہیں کس کے پیسے سے نکلتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ شاہی امام بڑے شاندار آدمی ہیں۔ اور وہ اس بات سے ناراض ہیں کہ یہ سرکار مسلمانوں کی فکر نہیں کرتی ہے۔ مسلمان غریبی میں مبتلا ہیں۔ مسلمان مصیبت زدہ ہیں۔ اور شاہی امام نے کہا ہے۔ میں انٹرویو کے الفاظ بتا رہا ہوں۔

imam and his Fallowers were Ready
For all Kinds of Sacrifices in Their —
Struggle Asaints what he calls a
Despatic and Fascist Government.

اگر شاہی امام کا کوئی جرم ہے تو وہ ہے سرکار کی مخالفت، اگر کسی مسجد سے سرکار کے

حق میں فتویٰ دیئے جائیں۔ اگر کسی مسجد کا امام چناؤ کے وقت کانگریس کو ووٹ دینے کے فتوے دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس امام کی تعریفوں کے پل باندھے جائیں گے مگر کوئی امام اگر مسجد میں کھڑے ہو کر جنتا کا ڈھنڈورا دے اور اس سے سرکار پر آنچ آتی ہو۔ تو اس امام کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔

یہ بات کہی جا چکی ہے کہ شری عبداللہ بخاری نائب امام تھے۔ جولائی ۱۹۷۳ء میں ان کی دستار بندی کی گئی۔ میر مشتاق احمد نے کی۔ میر مشتاق احمد بورڈ کے ممبر تھے اور اب بھی ہیں۔ اس وقت خواجہ دلی، مفتی عتیق الرحمان اور ڈپٹی کمشنر کپور بھی موجود تھے۔ جنرل صاحب بتائیں کہ دستار بندی کی گئی یا نہیں کی گئی؟

آخر سرکار روایت اور کنونشن کو نہیں مانتی۔ تو میں چاہوں گا کہ جیسے گوردواروں کے لئے گوردوارہ انتظامیہ کمیٹی ہے۔ ویسے ہی ہر مسلمان کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ مسجدوں کے انتظام کے لئے نمائندے چن کر بھیجے۔ ہر مسجد کی دیکھ بھال کے لئے انتظامیہ کمیٹی ہے۔

اردو کے اخباروں پر پابندی

اردو کے کئی اخباروں پر پری سنسر شپ لاگو کر دی گئی۔ ان پر پابندی عائد کر دی گئی۔ یہ کس قانون کے تحت ہوا۔ میں نہیں جانتا۔ "دعوت" کے شمارہ چھین لئے گئے ہفت روزہ "مارچ" کی کاپیاں ضبط کر لی گئیں۔ ایسا کس قانون کے تحت ہوا۔ میں نہیں جانتا۔ مگر جو اخباروں کو پری سنسر شپ کے آرڈر دیئے گئے ان میں لکھا گیا۔

"ایسے مضامین اور تصاویر کی اشاعت پر پابندی عاید کی جا رہی ہے جن سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو خطرہ پیدا ہو۔"

جھگڑا تھا اگر تو امام صاحب اور جنرل شاہنواز کا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اگر جھگڑا تھا تو امام صاحب کے مقلدین اور وقف بورڈ کے بیچ تھا اور اگر اس سے زیادہ تھا، تو پولیس اور جنتا کے بیچ کا تھا۔ اس جھگڑے میں کہیں ہندو مسلمان کا سوال نہیں تھا۔ پھر اخباروں سے کیوں کہا گیا۔ کہ تم کوئی ایسی چیز نہیں چھاپ سکتے۔ جس سے کہ کمیونل ہارمنی (فرقہ وارانہ ہم آہنگی) بگڑے۔

جناب عالی! جانچ اس لئے بھی ضروری ہے کہ پتہ لگانا چاہیئے۔ کہ دکانیں کیسے جلیں؟ کس نے جلائیں۔؟

ہمارے مسلم لیگ والے دِلّی میں بُرے ہیں، کیرل میں بھلے ہیں۔ کیرل میں ان کے ساتھ آشنائی چل رہی ہے۔ مگر دلّی میں ذرا ان سے جدائی کی مانگ ہے یہ راز میری سمجھ میں نہیں آتا۔

جامع مسجد کے دروازوں اور برجیوں پر گولیوں کے نشان ہیں یہ تو ۱۹۴۷ء میں بھی نہیں ہوا۔ انگریزی راج میں بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ کیوں ضروری ہوا۔ اور اگر جھگڑا وہاں ہو رہا تھا تو دکانیں تو پیچھے کی طرف ہیں ان میں آگ کیسے لگی۔ آگ لگائی گئی۔ اور آگ بجھانے والا انجن آنے میں دیر ہوئی جس میں لوگ زندہ بھُن گئے۔ اس کی بھی جانچ ہونی چاہیئے۔

امام صاحب کو چھوڑ دیا گیا اچھا کیا۔ مگر پکڑا کیوں تھا"؟ میسا میں! کیا ضابطہ فوجداری کی دفعات ختم ہو گئی تھیں۔؟

دِلّی کے لیفٹیننٹ گورنر کو بتایا جانا چاہیئے کہ انھیں پارٹی پالیٹیکس کا شوق ہے۔ انھوں نے انور دہلوی کو گھر پر بلا کر کہا۔ کہ "تم جن سنگھ کو چھوڑ دو تمہیں تو کانگریس میں آنا چاہیئے۔" لیفٹیننٹ گورنر کو سیاست میں داخل اندازی کا کوئی حق نہیں۔ اگر ہم سے بھڑیں گے تو ہم بھی ان سے بھڑ جائیں گے۔

(منقول ہفت روزہ اخبار "مارتنڈ" مورخہ ۷ مارچ ۱۹۷۵ء صفحہ ۷)

ابراہیم سلیمان سیٹھ نے کہا:۔

جامع مسجد اور اس کے ملحقہ علاقوں میں جو کچھ ہوا۔ اسے ایک المناک حادثہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ امام کو رہا کر دیا گیا ہے۔ میں نے اس حادثہ کے فوراً بعد ۲۴ فروری کو وزیر داخلہ سے ملاقات کر کے درخواست کی تھی کہ امام کو فوری طور

سے رہا کر دیا جائے۔ میں نے وزیر اعظم کی خدمت میں بھی عرضداشت بھجوائی تھی۔ مگر کسی نے توجہ دینا ضروری نہیں سمجھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر امام صاحب کو پہلے رہا کر دیا جاتا۔ تو جامعہ ہوٹل میں آتشزدگی کا واقعہ شاید نہ ہوتا۔ اس حادثہ کی اطلاع ملتے ہی میں کوچین سے دہلی آ گیا۔ بہرحال عقل مند آدمی جس کام کو وقت پر انجام دیتا ہے اسے نادان تاخیر سے کرتا ہے۔ فارسی کی ایک مشہور مثل یاد آ رہی ہے۔

ہر چہ دانا کند، کند ناداں ☆ لیک بعد از خرابیٔ بسیار

جب "میسا" کا قانون ایوان میں پاس کیا گیا تھا تو اس کی یقین دہانی دلائی گئی تھی۔ کہ اس کا غلط استعمال نہیں کیا جائے گا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ "میسا" کا استعمال آخر امام صاحب کے خلاف کیوں کیا گیا۔ کیا اس کی سرکار توضیح کر سکے گی۔

میں مطالبہ کرتا ہوں کہ پولیس کی زیادتی کے خلاف عدالتی تحقیقات کی جائے مجھے یقین ہے کہ عوام کو جس بیدردی اور تشدد کے ساتھ گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کی نظیر تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس مسئلہ پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو واضح ہو جائیگا۔ کہ امام اور وقف کے جھگڑے کو سرکار اور اس کے حواریوں نے نہایت غیر دانشمندی کے ساتھ بڑھاوا دیا۔ سرکار کا کہنا ہے۔ کہ امام کو مستقل نہیں کیا گیا تھا۔ اور یہ کہ وہ عارضی نائب امام تھے۔

مجھے کہنے دیجئے کہ کچھ سال قبل امام کو غیر ملکی دوروں پر بھیجا گیا تھا جن میں ماسکو خصوصی طور سے شامل ہے اور پاسپورٹ میں انھیں شاہی امام کہا گیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حکومت کھلے اس کا اعتراف کیا تھا کہ سید عبداللہ بخاری شاہی امام ہیں۔ آج وہ اس سے انکار کر رہے ہیں۔ اور شاہی امام عبداللہ بخاری کو میسا امام میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے موقعہ پر جب فتوؤں کی ضرورت پڑی۔ تو اس وقت سید عبداللہ بخاری کو شاہی امام کی حیثیت سے قبول کیا گیا تھا۔ میں نے یا میرے ساتھی شری لسمو یالمائے نے اس وقت انھیں یہ اعزاز نہیں دیا تھا۔ مگر ان کی اس حیثیت کو سرکار نے قبول کیا تھا۔

۱۹۷۳ء میں جب محترم حمید بخاری بیمار تھے تو اس وقت عبداللہ بخاری کو امامت کا درجہ عطا کیا گیا تھا۔ دلّی وقف بورڈ کے ایک ممبر اور موجودہ میٹروپولیٹن کے چیرمین شری مشتاق دستار بندی کی تقریب کے وقت موجود تھے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اس تقریب کے مہمانِ خصوصی اس وقت کے وزیر اوقاف شری فخرالدین علی احمد تھے۔ اور انھیں دستار بندی کے فرائض انجام دینے کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ اور توقع تھی کہ وہ تشریف لائیں گے۔ دعوت نامہ میں کہا گیا تھا۔ کہ وقف کے وزیر شری فخرالدین علی احمد رسم تنصیب کو ادا کریں گے۔ میں اس دعوت نامہ کو پیش کر سکتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کیوں عین وقت پر تشریف نہیں لا سکے یا تشریف لانے سے روک دیئے گئے۔

کشن گنج کے علاقے میں جو واقعات وقوع پذیر ہوئے انھوں نے امام صاحب کو برگشتہ خاطر کر دیا۔ اور انھوں نے سرکار کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ مجھے معلوم ہے کہ نائب مرکزی وزیر شری الیف سایچ محسن اور خورشید عالم صاحب راجیہ سبھا کے ممبر نے امام صاحب سے گفتگو کی۔ اور اس طرح حالات معتدل ہوئے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اچانک حالات اتنے خراب کیسے ہو گئے؟ یہ سوال ہمارے سامنے ہے۔ امام صاحب نے مظاہرے سے بہت قبل اعلان کرنا شروع کر دیا تھا۔ کہ بچوں کا گھر دریا گنج میں ہونے جا رہی میٹنگ کے وقت وہ مظاہرہ کریں گے۔ وزارت داخلہ اور وزارت وقف اس بات سے خوب آگاہ تھے۔ اس لئے انھوں نے پورے علاقے کی پولیس کے ذریعہ ناکا بندی کر رکھی تھی۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ جب امام صاحب دریا گنج کی طرف مارچ کر رہے تھے تو کیا پولیس نے انھیں روکنے کی کوشش کی؟ اس کے بعد وہ دریا گنج پہونچ گئے۔ وہ اس جگہ داخل ہونا چاہتے تھے جہاں وقف بورڈ کی میٹنگ چل رہی تھی۔ کسی نے انھیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بعد جب وہاں کچھ ہنگامہ ہوا اور اس کے فوراً بعد لاٹھی چارج ہوئی۔ اس کے بعد امام کو گرفتار کر لیا گیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکار نے امام کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے سازش کی۔ اور انھیں گرفتار کر لیا۔ ایسا لگتا ہے کہ شاہنواز خاں نے بذات خود اگر میں غلطی نہیں کرتا، کسی بیان میں کہا تھا کہ وہ امام کو گرفتار کرنے کے لئے مناسب وقت کے منتظر ہیں۔

میں نے اس طرح کے بیانات اخباروں میں دیکھے تھے وہ اس سے انکار کر سکتے ہیں۔ بیان میں کہا گیا ہے۔ کہ امام کو گرفتار کرنے کے لئے وہ مناسب موقع کی تلاش میں ہیں۔

(ایوان میں شاہنواز خاں نے اس کی پُر زور تردید کی)

ہو سکتا ہے۔ لیکن جو کچھ اخبارات میں آیا، میں وہ عرض کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے۔ کہ انھیں گورنمنٹ حراست میں لینا چاہتی تھی اور اس کے لئے اس نے باقاعدہ جال پھیلایا تھا چونکہ جامع مسجد میں گرفتاری ممکن نہیں تھی۔ اس لئے امام صاحب کو باہر آنے پر مجبور کیا گیا۔ مظاہرہ کا موقعہ دیا گیا۔ تاکہ انھیں اس طرح گرفتار کیا جاسکے۔

بہر حال کچھ بھی ہو۔ یہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہے کہ پولیس نے انتہائی قصائی پن کا ثبوت دیا۔ ۲ر فروری کو پولیس نے جو کچھ کیا اسے ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بالکل واضح ہے کہ پولیس نے غیر مسلم لوگوں پر فائرنگ کی۔ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ امام صاحب کی گرفتاری پر مظاہرین نے پتھر پھینکے ہوں گے جیسا کہ آج کل اس کا رواج ہو چلا ہے۔ مگر کیا فائرنگ کے لئے کوئی معقول جواز پولیس کے پاس ہے۔ ؟ کیا پولیس نے گولی چلانے سے قبل مجمع کو وارننگ دی تھی۔ کیا انھوں نے گولیاں برسانے سے قبل لاٹھی چارج، آنسو گیس۔ کا استعمال کیا تھا۔ پولیس والوں نے بالکل اچانک غیر مسلح ہجوم پر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ آپ لوگ بخوبی ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ مسجد اور اس کے دروازوں پر گولیوں کے نشانات ہیں۔ آخر یہ نشانات کس طرح آئے۔ پولیس چوکی جو بلندی پر واقع ہے وہاں سے پولیس نے گولیاں چلائیں۔ جس کی وجہ سے لوگ ہلاک ہوئے۔ مسجد میں خون کے نشانات ملے۔

(صاف ظاہر ہے) کہ یہ سب کچھ پولیس کا کیا دھرا تھا۔

میں جانتا ہوں مظاہرین کو منتشر کرنے کے لئے پولیس گولی چلا سکتی ہے۔ مگر براہ راست سینوں اور سروں کو کیوں نشانہ بنایا گیا۔ ؟ کیا پولیس ٹانگوں کو نشانہ نہیں بنا سکتی تھی؟ یہ ہے وہ بات جو میں وزارت داخلہ سے پتہ کرنا چاہتا ہوں۔ مرنے والے لوگوں کی عمریں ۱۸۔ ۲۰۔ ۲۴ اور ۲۸ سال تھیں۔ اس طرح ہندوستان کے خوش آئند مستقبل کو گولیوں سے ختم کر دیا گیا۔ میرے پاس مرحومین کی تصاویر ہیں۔

نہ صرف یہ بلکہ ایک معصوم طالبہ کو بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ "دعوت" میں مرنے والوں کی تصاویر شائع ہوئی ہیں۔ پولیس کے لوگوں نے گلیوں میں گھس کر پہلی اور دوسری منزلوں پر چڑھ کر جوانوں اور خواتین کو نشانہ بنایا۔

ایک اور معمہ بھی ہے جس کا حل کیا جانا ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ جامع مسجد کی پشت پر واقع دوکانوں میں آگ کس نے لگائی۔ یہاں میں اس علاقہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مبارکباد پیش کرنا چاہوں گا۔ جنہوں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو بنائے رکھا۔ اور بھائیوں بھائیوں کی طرح رہے۔ اس کے باوجود دوکانیں نذر آتش ہوگئیں۔ مسلمان اپنی دوکانوں کو خود نذر آتش نہیں کر سکتے۔

جب وہ اس لڑکی پر گولی چلا کر آئے تو اپنے ساتھ، ۳۷ روپے اور ایک گھڑی بھی لیتے آئے۔ ہر جگہ انھوں نے اثاثہ کو لوٹا، قزاقی کی، تو اس تمام نہاد سیکولر ملک کی پولیس کا یہ کردار ہے۔ (کہ وہ عوام کی حفاظت کے بجائے انھیں لوٹتی اور قتل کرتی ہے)

۱۵ فروری کو جمعہ کی نماز کے بعد ایک بار پھر فضا میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ نماز جمعہ کے بعد لوگ امام صاحب کی گرفتاری کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے، انھیں امام صاحب کی گرفتاری پر شدید غم و غصہ تھا۔ اور وہ اس کا اظہار کر رہے تھے۔ مسجد سے نکلنے کے بعد انھوں نے دیکھا کہ مسلح پولیس کی بھاری بھیڑ جمع تھی۔ (وہ لوگ اس سے مشتعل ہو کر مظاہرہ کر رہے تھے) اسی دوران جبکہ پولیس مجمع کو قابو میں کر رہی تھی، چاوڑی بازار (سے ملحق) میں جامعہ ہوٹل میں آگ لگا دی گئی۔ اور نچلی منزل میں لوگ جل کر بھن گئے۔ پولیس کو بتلایا گیا تھا کہ اندر لوگ ہیں، مہربانی کر کے دروازہ کھول دیں تاکہ وہ باہر آسکیں۔ مگر پولیس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اور پولیس کی آنکھوں کے سامنے لوگ جل بھن گئے۔ جن میں ایک ساٹھ سالہ بوڑھا آدمی بھی شامل تھا۔

یہ سب کچھ دارالحکومت دلی میں سرزد ہو رہا ہے۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی کی ناک کے نیچے ـــــ وزیر داخلہ برہمانند ریڈی کی ناک کے نیچے! ایک طرف گولیاں چلائی جاتی ہیں۔ آگ لگائی جاتی ہے۔ اور دوسری طرف بے گناہوں کو جھونپڑیوں سے نکال کر

کرفیو کی خلاف ورزی کرنے کے جھوٹے جرم میں جیلوں میں ٹھونسا جاتا ہے۔ مسلم لیگ کے ورکروں کو امن قائم رکھنے کے لئے انتظامیہ نے مدعو کیا اور جب وہ لوگ آئے تو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ کرفیو کے دوران لوگوں کی زندگی حرام ہو گئی۔ وہ افلاس کے شکار لوگ فاقوں کی زد میں بھی آ گئے۔ کیا حکومت نے انھیں راحت پہونچانے کا کوئی سامان کیا۔؟

جب ایف۔ ایچ۔ محسن سے میں نے رابطہ قائم کیا۔ تو انھوں نے کہدیا "میں کیا کر سکتا ہوں، یہ سب کچھ دلی ایڈمنسٹریشن کی ذمہ داری ہے۔" بہر حال انھوں نے اس کے باوجود مہربانی کی۔ اور ٹیلی فون پر انتظامیہ کے ذمہ داروں سے درخواست کی۔ کہ انسانیت کے ناطے بھوک اور فاقے سے مرنے والے لوگوں کی مدد کی جائے اور ان کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

جیل میں قید تمام لوگوں کو فوری طور سے رہا کیا جائے۔ امام صاحب کو رہا کر کے آپ لوگوں نے کوئی تیر نہیں مارا ہے۔ وہ سینکڑوں لوگ جو جیل کی چار دیواری میں قید ہیں۔ جن کے بیوی اور بچے مصائب و آلام کے شکار ہیں۔ ان کے لئے آپ نے کیا کیا۔؟

پولیس کی زیادتیوں کی عدالتی تحقیقات ہونی چاہیئے۔ جامعہ ہوٹل کی آتش زنی کی تحقیقات ہونی چاہیئے۔ لوگوں کو غیر مشروط طور پر رہا ہونا چاہیئے۔ جن کی دوکانیں لٹی اور جلی ہیں، انھیں معاوضہ ادا کیا جانا چاہیئے۔ مہلوکین کے خاندانوں کو خاطر خواہ معاوضہ ادا کیا جانا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ امن و امان برقرار رکھنے کی خاطر میری مانگوں کو سرکار قبول کرے گی۔ امن و امان برقرار رکھنے، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو قائم رکھنے میں، میں حکومت کے ساتھ اشتراک کرنے کو تیار ہوں۔

(منقول ہفت روزہ "مارچ" صفحہ ۸ مورخہ ۸ مارچ ۱۹۷۵ء)

یونس سلیم نے کہا:۔

۲ فروری ۱۹۷۵ء کو بدقسمتی سے حادثہ پیش آیا۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ پہلا مسٹر عبداللہ بخاری کا جامع مسجد کا امام مقرر کیا جانا۔ یہ مسئلہ دہلی مسلم وقف بورڈ اور مسٹر عبداللہ بخاری اور

ان کے والد کے درمیان ایک تنازعہ تھا۔ اس وجہ سے ہم اس میں نہیں پڑے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے۔ کہ میرے دوست مسٹر قریشی نے وقف بورڈ اور مسٹر بخاری کے درمیان ثالث بننا قبول کر لیا ہے۔ اور جس میں توقع کرنا چاہیئے کہ نتائج اچھے ہی نکلیں گے۔ لیکن ۲ر فروری ۱۹۷۵ء کو جو بدقسمت حادثہ پیش آیا سنگین نتائج کا حامل ہے۔ یہ حادثہ اچانک ہی نہیں پیش آیا۔ یہ بات اخبارات میں بھی آچکی ہے اور عوام بھی اس سے باخبر ہیں۔ کہ مسٹر عبداللہ بخاری اشتعال انگیز تقاریر نماز کے وقت جامع مسجد سے کرتے تھے۔ دو فروری کو جب یہ حادثہ پیش آیا۔ وزیر جنرل شاہنواز خاں مسلم وقف بورڈ کی زونل کمیٹی کا افتتاح کرنے بچوں کا گھر دریا گنج گئے تھے۔ یہ بات بھی اخبارات میں آچکی ہے۔ کہ صبح سات بجے سے ہی مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے اشتعال انگیز تقاریر کی جاتی رہی تھیں۔ جس میں عوام کو بچوں کے گھر مظاہرہ کرنے کی ترغیب دی جا رہی تھی۔ جب نقض امن کا اندیشہ تھا، جب وقف بورڈ کو دھمکی آمیز خطوط موصول ہو رہے تھے، اور جب امام کے حامیوں کا رویہ مشتبہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت مظاہرہ کو روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی۔ یہ بے ہنگم مظاہرہ جنرل شاہنواز مردہ باد کے نعرے بلند کر رہا تھا۔ جب امام عبداللہ کی رہنمائی میں یہ مظاہرہ بچوں کا گھر پہونچا انھوں نے بزور طاقت آہنی دروازہ توڑ دیا۔ اور بچوں کے گھر کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ اگرچہ پولیس وہاں موجود تھی۔ لیکن کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ مظاہرین نے شامیانہ گرادیا اور یتیم خانہ کا فرنیچر توڑ ڈالا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کے ایماء پر شاہنواز خاں کو ملحقہ کمرے میں پناہ لینا پڑی۔ اس ہنگامے کے بعد ہی امام اور دیگر افراد کو گرفتار کیا گیا۔ بچوں کے گھر سے یہ لوگ جامع مسجد واپس گئے اور اشتعال انگیز تقاریر کرنے لگے۔ انھوں نے لوگوں کو مشتعل کرنے کے لئے کہا۔ کہ امام کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور پولیس نے انھیں بری طرح زدوکوب کیا ہے۔ سوال ہے۔ کہ ان افراد کے خلاف اقدام کیوں نہیں کیا گیا۔ اور دفعہ ۱۴۴ کیوں نہیں نافذ کی گئی۔

میں نے خود جا کے حادثہ کا معائنہ کیا۔ اور میں نے جامع مسجد کے دروازے پر گولیوں کے نشانات دیکھے ہیں۔ جہاں لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے۔ اور لوگ مارے گئے ہیں۔

بہت سے معصوم افراد جو اپنے گھروں میں بیٹھے تھے وہ مارے گئے۔ دہلی کالج کی ایک طالبہ
کو بھی پولیس نے اس کے گھر میں گولی ماری۔ جن لوگوں کا رویہ قابلِ اعتراض ہوتا اور ج
غیر قانونی حرکتیں کر رہے ہوتے، ان پر اگر پولیس گولی چلاتی تو یہ سمجھ میں آسکتا تھا اور اس
کے لئے کچھ نہ کچھ جواز دیا جا سکتا تھا۔ لیکن ان لوگوں کو قتل کا کیا جواز ہے جو گلیوں میں
اپنے مکانات میں تھے اور معصوم تھے۔ سوال ہے معصوم افراد کو قتل کرنے کا کیا جواز ہ
جامع مسجد کے عقبی حصے میں ۲ دوکانیں جل گئیں۔ یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم فرقے
افراد نے جامع مسجد سے ملحقہ دوکانوں اور عمارت کو نقصان پہنچایا۔ سوال ہے کہ کیا ا
دوکانوں کی آتشزدگی میں کسی کی شرارت ہے۔

میں نے مسجد میں جن سنگھ کے انور علی دہلوی اور کنور لال گپتا کو بیٹھے ہوئے دیکھا
لوگ امام کے لڑکے کے ساتھ بیٹھے تھے۔ سوال ہے مسجد میں کیا سازش کی جارہی تھی۔ اور ا
لوگوں کا وہاں کیا کام تھا۔

۱۴ر فروری کو کیا ہوا کچھ فرقہ پرست تنظیموں نے صورت حال کا فائدہ اٹھا کر لوگو
سیاہ بلّے تقسیم کئے اور عوام کو مشتعل کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ جامعہ ہوٹل جل گیا۔ جن معص
افراد نے ہوٹل میں پناہ لی تھی۔ انھیں بھون دیا۔ یہ ہوٹل ایک مسلمان کا تھا میں ان واق
پر صفائی چاہتا ہوں۔ اس حادثہ سے قبل اشتعال انگیز اور قابلِ اعتراض مضامین مختلف
فرقہ پرست تنظیموں کے پرچوں میں شائع ہوتے۔ سوال ہے کہ ان پرچوں کے خلا
حکومت نے اقدام کیوں نہیں کیا۔ ہر شخص صورت حال پر مگر مچھ کے آنسو بہا رہا ہے۔

مسٹر جے پرکاش نرائن کا بیان واضح کر رہا ہے کہ وہ تنگ مسلم فرقے کے ہمدرد بن گ
ہیں۔ اتنے افراد مارے گئے اور جائداد جل گئی لیکن کوئی شخص ان کی مدد کو آگے نہیں
ہر شخص سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

(منقول از ہفت روزہ "مارچ" صفحہ ۳ مورخہ یکم مارچ ۱۹۷۵ء)

گدیش ماتھر نے کہا :۔

مسٹر یونس سلیم کی پارٹی اور مسٹر ادم مہتہ کے بیانات اور مسٹر قریشی کے اس معاملے ں ثالث بنائے جانے کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ معاملہ عوام کا نہیں ہے بلکہ کانگریس پارٹی اپنا نجی معاملہ ہے۔ عوام کا معاملہ نہیں ہے۔ اس حادثہ میں ۱۴ افراد کی جانیں گئیں، اور ھوں روپے کی جائداد تباہ ہوئی۔ سارے ملک نے مطالبہ کیا۔ کہ اس حادثہ کی تحقیقات رائی جائے۔ تاکہ پتہ لگے کہ اتنے افراد کیوں ہلاک ہوئے۔ اور اس کا جرم کس پر ہے۔ لیکن سے تسلیم نہیں کیا گیا۔ حکومت نے صرف ایک معاملے کو لے کر مسٹر قریشی کو ثالث بنا دیا۔ اور ن سے کہا۔ کہ وہ یہ معاملہ طے کریں۔ سمجھا جاتا ہے۔ کہ مسٹر قریشی اس معاملے کو طے نہیں کر سکے سٹر بخاری کو حکومت نے شاہی امام تسلیم کیا۔ وقف بورڈ نے انھیں شاہی امام بنایا۔ اگر یسا نہیں ہوتا تو ان کو ایک وفد کے ساتھ روس کیوں بھیجا جاتا۔ اتنا ہی نہیں، ہمارے حکمہ صحت نے خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں امام صاحب کی ایک اپیل شائع کرائی تھی۔ اس وقت تک سب باتیں ٹھیک تھیں۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ جامع مسجد کے علاقے میں مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہے۔ اور ان کا کوئی سدھار نہیں ہوتا۔ انھوں نے اس کے لئے ایک پلان بنایا۔ اور اس کے بعد جب وہ کانگریس کے خلاف بولنے لگے تو کانگریسیوں کے ماتھے پر شکنیں پڑنے لگیں۔ مسٹر شاہ نواز خاں نے ایک بیان دیا۔ کہ انھوں نے وزیر اعظم کے خلاف ولگر زبان کا استعمال کیا ہے۔ اور یہ ولگر زبان کیا تھی۔ کہ وزیر اعظم جھوٹ بول رہی ہیں۔" امام صاحب نے کہا تھا کہ وزیر اعظم جھوٹ بول رہی ہیں انھوں نے سارے ملک کو برباد کیا ہے۔ یہ دونوں باتیں ہم بھی کہتے ہیں کہ وزیر اعظم کی کئی باتیں صحیح نہیں ہوتیں۔ ہم سب کہتے ہیں کہ کانگریس نے ملک کو برباد کیا ہے۔ یہ باتیں ار اگست کو کہی گئی تھیں۔ محسن صاحب کو معاملہ سلجھانے کے لئے مقرر کیا گیا۔ لیکن کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ امام صاحب کانگریس کی پناہ میں نہیں آسکے۔ ان کو اپنی پناہ میں لینے کا ایک طریقہ نکالا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اتنے افراد کی جان کانگریسی حکومت نے لے لی۔

میں الزام لگاتا ہوں کہ یہ کانگریس کی سازش تھی جس کے نتیجہ میں اتنے بے گناہ لوگوں کی جان گئی۔ امام کے خلاف اگر کوئی الزام تھا تو انھیں عدالت میں لے جا کر ان کے خلاف مقدمہ چلانا چاہیئے تھا۔ اگر وہ قصور وار ہیں تو ان کے بارے میں ہم کوئی رو رعایت نہیں چاہتے۔ پہلے انھیں شاہی امام بنایا گیا اور روس بھیجا گیا۔ پھر انھیں نائب امام بنا دیا گیا۔ یہ کتنی بڑی سازش تھی۔ اس سارے حادثہ کے پیچھے آخر کس کی غلطیاں ہیں؟ دہلی کے مسلمانوں کی کیا شکایتیں تھیں۔ ابھی یونس سلیم صاحب کہہ رہے تھے کہ جن سنگھ والے مسجد میں گئے۔ مسٹر انور دہلوی میٹروپالیٹن کونسل میں جن سنگھ کے ممبر ہیں وہ ایک ایم۔ ایل۔ اے کے برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ مسلمان ہیں۔ ان کو حق ہے مسجد میں جانے کا اور نماز پڑھنے کا۔ اگر انور صاحب مسجد میں جاتے ہیں تو یونس سلیم صاحب کے پیٹ میں کیوں درد اٹھتا ہے۔ وہ تو ایک مسلمان کے ناطے گئے تھے۔ (مسٹر یونس سلیم نے اس موقع پر کہا) کنور لال گپتا کیوں گئے تھے۔ مسٹر ماتھر نے کہا۔ کہ کنور لال گپتا دلّی کے شہری ہیں۔

کیا دلّی کے شہریوں کو گولی سے اڑا دیا جائے گا تو ـــ اس پر یونس سلیم صاحب بولے۔ کہ گپتا صاحب کبھی نماز پڑھنے گئے ہوں گے۔ جس کے بعد مسٹر ماتھر نے کہا۔ کہ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ کسی مسجد میں ہندو نہیں جا سکتا۔ یہاں پر کئی مسلمان ممبر بیٹھے ہیں۔ وہ بتائیں کہ کسی مسجد میں کوئی غیر مسلم نہیں جا سکتا۔ اس سارے معاملے کی جڑ وقف بورڈ ہے جس کو حکومت نے اپنی جاگیر تسلیم کیا ہوا ہے۔ دلّی ہی نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے مسلمان ہی کہتے ہیں۔ کہ وقف بورڈ جس طرح کا ادارہ بن گیا ہے۔ اس میں وقف کی ساری جائداد حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ وقف بورڈ میں کون لوگ ہیں کوئی آدمی شملہ میں بیٹھا ہے، کوئی پنجاب میں ہے۔ کوئی کہیں ہے اور باہر سے اس کا نظم سنبھالتا ہے۔ دلّی میں میر مشتاق صاحب کے ایک بہت بڑے رشتہ دار ہیں۔ جن کی دہلی میں موٹر ٹرانسپورٹ کی بسیں چلتی ہیں۔ کشمیری گیٹ کے اندر ان کی دو کانوں میں ایک ایک دوکان کے نذرانے کے اندر ۲۵ / ۲۵ ہزار روپے آتے ہیں۔ لیکن اس کا

پیسہ کہاں سے آتا ہے۔ ساری دہلی میں ۵ کروڑ سے زائد وقف کی جائداد ہے۔ ۵ کروڑ کی جائداد سے جتنا روپیہ آنا چاہیئے وہ وقف میں آتا نہیں ہے۔ صرف ۲۵ ہزار روپیہ آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام نے کہا کہ اس کا انتظام صحیح ڈھنگ سے ہونا چاہیئے۔ آج دہلی کی جامع مسجد کی دریاں پھٹی ہیں۔ کیونکہ سارا روپیہ وقف بورڈ کے لوگ کھا جاتے ہیں۔

منقول از ہفت روزہ "مارچ صفحہ ۳ مورخہ یکم مارچ ۱۹۷۵ء)

راج نرائن نے کہا:۔

میں یہ چاہوں گا کہ جب کسی اہم موضوع پر بحث و مباحثہ ہو تو حکومت اسے خاموشی وسکون کے ساتھ سُنے اور جو صحیح بات ہو اسے تسلیم کرے۔

مٹیا محل (جامع مسجد) سے سوا سال کا بچہ چھت پر سے گر کر مرا تو کیا پولیس نے اسے اٹھا کر ہسپتال لے جانے کی ذرا بھی کوشش کی؟ میری معلومات کے مطابق پولیس نے اسے اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور وہ مر گیا۔ دوسری بات میں یہ کہوں گا کہ لڑکی کے بارے میں مسٹر اوم مہتہ نے لمبی چوڑی صفائی دی۔ اس سچ کو کیوں قبول نہیں کیا۔ کہ اسے گھر میں گھس کر گولی ماری گئی۔ میں وہاں گیا اور وہاں جاکر پوری تحقیقات کی ہے۔ میں نے جامع مسجد کا بڑا پھاٹک بھی دیکھا ہے۔ وہاں اور دیوار پر میں نے گولی کے نشانات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ ۵ رفروری کو میں نے جامع مسجد کا معائنہ کیا۔ وہاں میں نے خون کے دھبے دیوار پر اور فرش پر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ کیا اوم مہتہ صاحب بتائیں گے کہ جامع مسجد کے اوپر خون کے دھبے کیسے لگے۔؟ جامع مسجد پر گولی کیوں چلی۔ امام صاحب کے ٹیلیفون تار کاٹ دیئے گئے۔ بجلی کے تار کاٹ دیئے گئے۔ جب میں پانچ تاریخ کو وہاں گیا تب بھی ان کے ٹیلیفون کام نہیں کر رہے تھے۔

آپ دیکھئے پولیس نے اپنی چوکی کے اوپر سے فائرنگ کی۔ کیا یہ اس کے لئے

مناسب تھا۔ ان باتوں کے علاوہ پہلے میں مبارکباد دینا چاہوں گا۔ دہلی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو، جنہوں نے مل کر اوم مہتہ کی حکومت کے ذریعہ اس کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی پوری کوشش کے باوجود اس معاملہ کو فرقہ وارانہ رنگ نہیں دینے دیا۔ اس کے لئے میں پھر دہلی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔

سوال ہے کہ امام صاحب سے مشتاق صاحب جیل میں مل سکتے ہیں لیکن راج نرائن ان سے نہیں مل سکتا۔ کیا ہم اس ملک کے دوسرے درجہ کے شہری ہیں۔

پچھلے تین سو سال سے امام مقرر ہونے کا ایک ڈھنگ ہے۔ میں دیانتداری کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر اس ایوان کے محترم ممبران چاہتے ہیں۔ کہ اس طرح کے واقعات پھر نہ ہوں تو یہ ضروری ہے کہ اس قسم کے امور میں کوئی باہری دباؤ نہ ہو۔ مسٹر اوم مہتہ یہ بتائیں کہ کیا اس حکومت کی پوری کوشش یہ نہیں ہے کہ وقف بورڈ کو سرکاری قبضہ میں رکھا جائے۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ جب سید علی ظہیر نے اتر پردیش اسمبلی میں شیعہ مسلم اوقاف کا قانون پیش کیا تھا۔ تب بھی ہم نے یہی کہا تھا کہ سرکار مسلم اوقاف کو اپنے قبضہ میں کرلنے کی سازش کر رہی ہے۔ تاکہ اس روپیہ سے حکمراں پارٹی ناجائز کام کرے۔

میں سوال کرتا ہوں کہ موجودہ امام صاحب کے جب پگڑی باندھی گئی تھی۔ اس وقت وقف بورڈ کے ممبر میٹروپولیٹن کونسل کے چیئرمین میر مشتاق نہیں تھے؟ کیا دہلی کے ڈپٹی کمشنر اس وقت وہاں موجود نہیں تھے؟ میری معلومات ہیں کہ وہ وہاں تھے۔ کیا عبداللہ بخاری کو حکومت ہند کی طرف سے مسلم ممالک میں اور روس میں مسلمانوں کے نمائندے اور بحیثیت شاہی امام جامع مسجد نہیں بھیجا گیا؟ کیا فیملی پلاننگ کے پمفلٹ پر سید عبداللہ بخاری امام جامع مسجد کا فتویٰ شائع نہیں کیا تھا۔ اور کیا ریڈیو پر چاند نکلنے کا اعلان اس طرح نہیں ہوتا تھا۔ کہ دہلی کے شاہی امام صاحب عبداللہ بخاری اطلاع دیتے ہیں کہ آج عید کا چاند ہوگیا ہے۔

دو پہری کو یکایک شاہ نواز خاں صاحب وہاں پہونچتے ہیں اور سازش ہوتی ہے کہ امام صاحب کو بدلا جائے۔ جس آدمی کو آپ غیر ممالک بھیج چکے ہیں۔ وہ آدمی جب

۱۵ اگست کو ہند کی وزیر اعظم لال قلعہ سے بول رہی تھیں۔ اپنا ایک مانگ الگ سے لیکر ملک کی سچی حالت بتا رہا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ مسلمان لوگ وزیر اعظم کے چکر میں نہ پڑیں یہ مسلمانوں کی دشمن ہیں، دلش کو کھانا چاہتی ہیں، بالکل غلط اور جھوٹ بولتی ہیں۔ اس لئے جس ترقی کا وزیر اعظم اعلان کر رہی ہیں وہ غلط ہے۔

دو اپریل ۱۹۷۳ء کو جناب فخر الدین علی احمد نے تسلیم کیا تھا کہ پنجاب وقف بورڈ ۹ لاکھ ۶۲ ہزار ۸ سو ۳۲ روپے ۳۲ پیسے پنجاب اور ہریانہ سے باہر دہلی کے انڈین مرکنٹائل بنک میں تبدیل کیا گیا۔ یہ میں آپ کو مثال دے رہا ہوں کہ کس طرح وقف بورڈ کی ساری آمدنی آج حکمراں گروپ اپنے قبضہ میں کرنا چاہتا ہے کہیں ۹۰ ہزار روپے کہیں ۱۰ ہزار روپیہ، تو میں آپ سے کہوں گا کہ اس کی عدالتی تحقیقات ہو۔ میں یہ بات کہتا ہوں کہ جس دن سے جسٹس رے کو سینئر ججوں پر فوقیت دے کر چیف جسٹس بنایا گیا ہے۔ اس دن سے ہم عدالتی تحقیقات کا مطالبہ نہیں کرتے۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ جتنی بھی مخالف پارٹیاں ہیں۔ ان کے اچھے لوگوں کو منتخب کرکے سارے حادثہ کی تحقیقات کے لئے ایک پارلیمانی کمیٹی مقرر کی جائے۔

ایک فردِ واحد کے سبب ۹ نوجوانوں کا نقصان ہوا

لفٹننٹ گورنر کرشن مہنتہ کو بخاری صاحب کے اپنے ہاتھ میں قانون لینے پر افسوس

نئی دہلی ۴ رفروری :۔ دلی کے لیفٹننٹ گورنر نے جامع مسجد کے واقعہ کے سلسلہ میں اپنے بیان میں کہا کہ اتوار کے دن جامع مسجد کے اس المناک حادثات کا اصل سبب کیا تھا۔ جن کے نتیجے میں ۹ جانیں ضائع ہوئیں۔ اور سو سے زیادہ افراد زخمی ہوگئے ؟ صرف ایک فرد جناب عبداللہ بخاری کا یہ اصرار کہ انھیں امام جامع مسجد کا خطاب دیا جائے اور مسلمانوں کا مذہبی ادارہ وقف بورڈ ان کی اس حیثیت کو تسلیم کرلے۔

لفٹننٹ گورنر مسٹر کرشن نے پیر کے دن اس امر کا انکشاف کیا۔ کہ بخاری صاحب کم از کم جولائی ۱۹۷۳ء سے اپنے اس حق کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ لفٹننٹ گورنر نے کہا — کہ عبداللہ بخاری صاحب کے والد مولانا سید حمید دراصل امام ہیں۔ اُن کو ہمیشہ سے مسلمانوں کا اعتماد حاصل رہا ہے۔ اور وقف بورڈ اُن کو جائز اور صحیح طریقے سے نامزد کردہ امام تسلیم کرتا ہے۔ مسٹر کرشن چند نے کہا۔ کہ بخاری صاحب وقف بورڈ پر مختلف طریقوں سے خود کو امام تسلیم کرانے کے لئے دباؤ ڈالتے رہے ہیں وہ مسجد کے مقدس حدود کے اندر سے وقف بورڈ کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کرتے رہے ہیں۔

اتوار کے تکلیف

جب بخاری صاحب نے جمع سو افراد کی قیادت کرتے ہوئے وقف بورڈ کے اُن ممبران پر جسمانی حملہ کیا۔ جن کی دریا گنج میں میٹنگ ہورہی تھی۔

بخاری صاحب کے حملہ کا خاص نشانہ وقف بورڈ کے چیرمین مسٹر شاہنواز خاں مرکزی وزیر مملکت برائے زراعت کی ذات تھی۔

لفٹننٹ گورنر نے کہا۔ کہ انتظامیہ کو توقع تھی کہ دانشمندی سے کام لیا جائے گا۔ اور ایک فرد واحد کی شکایت یا تکلیف کو خواہ وہ کیسی ہی غلط بنیادوں پر مبنی کیوں نہ ہو۔ پُرامن طریقہ سے حل کرلیا جائے گا۔

لیکن یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ کہ بخاری صاحب نے قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا واقعات کی تفصیل سے بات صاف طور سے ظاہر ہوجاتی ہے کہ بخاری صاحب کے تمام کام پہلے سے طے شدہ منصوبہ کے مطابق تھے۔

(منقول روزنامہ الجمعیتہ دہلی مورخہ ۶ رفروری ۱۹۷۵ء صفحہ ۴)

شمیم احمد ممبر پارلیمنٹ نے کہا شمیم صاحب نے کہا ہے کہ امام کے ساتھ دکان داری اس سرکار نے کی ہے۔ میں یہاں سے شروعات کرتا ہوں کہ نہ صرف امام کے ساتھ بلکہ آزادی ملنے کے بعد سے آج تک ہندوستان کی گدی پر جو لوگ تشریف فرما ہیں انھوں نے تمام مسلمانوں کے ساتھ دوکانداری کی ہے کرتے رہے ہیں۔ آزادی ملنے کے بعد سے ہی انھیں اکثریت کا خوف دکھلایا گیا اور کہا گیا کہ اگر آواز نکالوگے تو ختم کر دیا جائے گا اور اس ضمن میں۔ کبھی جن سنگھ کو گھسیٹا گیا اور کبھی کسی اور کو۔ ان کو کہا گیا کہ بحث کر کے آگے مت بڑھنا۔ بولنا مت۔ شیر بن کر مت رہنا۔ اور اگر شیر بننے کی کوشش کروگے تو جس طرح سے شیر کشمیر کو جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ اسی طرح سے تم کو بھی ڈال دیا جائیگا۔ اس واسطے بلی بن کر رہو اور ایسا اگر تم نے کیا تو گدی پر بٹھا دیئے جاؤگے۔ یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تقدیر ہے۔

عبداللہ بخاری جب تک جامع مسجد لاؤڈ اسپیکر پر کانگریس سرکار کے حق میں بولتے رہے تو کسی نے اعتراض نہیں کیا اور جب انھوں نے حکومت کی خامکاریوں کی طرف اشارے کئے۔ وقف بورڈ کی نااہلیتی کو نشانہ تنقید بنایا۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی اور کانگریس پارٹی کی دھجیاں اڑائیں تو کہا گیا کہ مولانا عبداللہ بخاری پالیٹکس کر رہے ہیں یہ گناہ ہے۔ پتہ نہیں کتنی مسجدوں میں آج بھی کتنے امام اور مولوی حضرات انتخاب کے وقت کانگریس پارٹی کو ووٹ دینے کیلئے فتویٰ دیا کرتے ہیں۔ لیکن تب وہ پالیٹکس نہیں کرتے لیکن جب کانگریس کے خلاف چلے جاتے ہیں تو گنہگار ہو جاتے ہیں یہ مسلمانوں کی ہندوستان میں تقدیر ہے۔ گذشتہ ۲۷ سالوں سے کانگریس پارٹی نے ان کو اپنا ووٹر بنا رکھا ہے الزام ہے کہ امامت ورثے میں نہیں چلا کرتی۔ حکومت کی مرضی پر چلا کرے گی۔ جمہوریت میں جو بڑے بڑے عہدے ہیں وزیر اعظم کے وہ تو وراثت میں چل سکتے ہیں امامت کا نہیں اصل میں جو لوگ سرکار چلا رہے ہیں ان میں سے کچھ کرسی وراثت میں پاتے جا رہے ہیں۔ مذہب کی وراثت نہیں چلے گی۔ اب جمہوریت اور سیاست کی وراثت چلے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

پنجاب کی ایک مسجد کے بارے میں مجھے بتلایا گیا ہے کہ اس مسجد سے ملحق جو دوکان کرائے پر اٹھائی گئی ہے اس دوکان میں ہوٹل اور شراب کا اڈہ کھولا گیا ہے۔ کون ہے اس کا چیرمین کانگریس پارٹی کے ایم پی ہیں (طیب حسین کی طرف ہے)

۳۰ر جولائی کے سوال نمبر ۱۰۲۳ کا تحریری فخرالدین علی احمد کا جواب بھی میرے پاس ہے جس میں انھوں نے مانا ہے کہ پنجاب وقف بورڈ کی ایک مسجد کو کرائے پر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ حضرت چیئرمین ہو گئے ہیں۔ ان پر ۳۰۲ کے مقدمے بھی چل رہے ہیں۔ ان پر موٹر چرانے کا مقدمہ درج ہے اس کے بعد بھی وہ چیئرمین بن گئے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ جب تک مسلمان آپ مرضی و منشا کے مطابق کام کرتا رہے تب تک وہ وفادار (ایماندار) اور مذہبی مسلمان ہے۔ جیسے ہی آپ کے خلاف انگلی اٹھانے لگے گا اس کی انگلی توڑ دی جائے گی۔

ہندوستان کی سرکار جامع مسجد کے علاقے کو کربلا کا میدان بنانا چاہتی ہے اس کا کیا مطلب ہے۔ یہ لوگ ہندوستان کے مسلمانوں کو کیوں ٹیبر رائٹر اور دکھی کرنا چاہتے ہیں۔ کیا مقصد ہے اس کا۔ جانور پانی بنا تڑپ تڑپ کر مر جائیں بچے کو چوٹ لگ جائے لیکن کرفیو کی وجہ سے اس کو دوائی نہ مل پائے اور وہ تڑپ تڑپ کر مر جائے یہ پولیس کی دہشت اور جنگلی پن ہے۔ وہ شری برہمانند ریڈی اور اس سرکار کی پولیس ہے۔

یہ جھگڑا جن سنگھ ...... اور مسلمانوں کا نہیں ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں کا نہیں ہے جھگڑا سرکار اور مسلمانوں کا ہے امام صاحب نے غلطی کی، مسلمانوں نے غلطی کی کہ انھوں نے آپ کے (سرکار کے) خلاف جلوس نکالا۔ لیکن جامع مسجد نے آپ کا کیا بگاڑا تھا؟ جامع مسجد کی بجلی اور پانی دو دن کیلئے کاٹ کر رکھ دیا گیا۔

اس بات کو نوٹ کیا جانا چاہیئے کہ یہ لوگ (کانگریسی) اپنی غلطی کو چھپانے کیلئے ہمیشہ دوسروں پر انگلی اٹھایا کرتے ہیں اپنی کھلی ہوئی غلطی کیوں نہیں مانتے۔ یہ واردات ہوئی ہے صرف عبداللہ بخاری صاحب کی رہائی سے معاملہ ختم نہیں ہو جائے گا۔ لوگوں کی جانیں گئی ہیں کس کی غلطی سے گئی ہیں اس کی جانچ ہونی چاہیئے۔ میں یہ بھی کہوں گی کہ یہاں کے وقف بورڈ کو ختم کر دیا جائے۔ جامع مسجد یا مسلمانوں کے لئے ہی وقف بورڈ کیوں؟ سکھوں کے گوردوارہ کیلئے تو کوئی منسٹری یہاں نہیں ہے۔ آریہ سماج کی بہت بڑی جائداد ہندوستان میں ہے۔ اس کے لئے کوئی وزیر نہیں رہتا ہے کوئی بورڈ نہیں بنتا ہے لوگ خود اپنا کام چلایا کرتے ہیں۔ یہ مذہبی معاملے ہیں ان میں سرکار کیوں دخل دیتی ہے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے بیچ میں کہیں نہ

کہیں بنگلنگ (bungling) کرنا ہے۔

مندروں کے لئے کیا کوئی وزیر ہے۔ کیا پنڈت کملاپتی ترپاٹھی ہیں جہاں تک دیو استھان (ہندوؤں کے مقدس مقامات) کا سوال ہے کیا سرکار کی طرف سے اس میں کوئی سیدھا دخل ہے۔ آریہ سماج کی جائداد کو دیکھنے کیلئے کیا سرکار دخل دیتی ہے اگر نہیں دیتی ہے آخر مسلمانوں کے وقف ہیں۔۔۔۔ سرکار اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہے۔ اس سے آپ (سرکار) پر شک پیدا ہوتا ہے اس لئے وقف بورڈ کو ختم کر دیجئے۔ مسلمانوں پر چھوڑ دیجئے کہ وہ کیسے اپنی جائدادوں کو چلائیں۔ کیسے ان کا انتظار کریں۔

میں چاہوں گا کہ نہ صرف دلی کے پولیس افسروں اور دلی کے لیفٹننٹ گورنر کے خلاف کارروائی ہو۔ بلکہ وزیر داخلہ کے خلاف بھی کارروائی ہونا چاہیئے۔ اگر وزیر اعظم یہاں موجود ہوتیں تو میں ان کے سامنے کہتا کہ آپ کا وزیر داخلہ اس طرح کی حرکت کر رہا ہے ہندوستان کا مسلمان اپنے کو بھارت سرکار کے جھنڈے کے نیچے۔۔۔۔ غیر محفوظ محسوس کر رہا ہے۔

منقول از ہفت روزہ "مارچ" نئی دہلی ۸ر مارچ ۱۹۷۵ء

شریمتی سبھدرا جوشی نے کہا:۔ جناب عالی!

جس دکھ بھری کہانی پر آج یہاں مباحثہ ہو رہا ہے۔ وہ سچ مچ اس قدر افسوس ناک ہے، جس کا بیان کرنا بہت مشکل کام ہے اس سے بھی زیادہ دکھ مجھے اس بات سے ہو رہا ہے۔ جب میں دیکھتی ہوں کہ ہمارے حزب اختلاف کے لوگ ایسا کر رہے ہیں جیسے کسی کے گھر میں آگ لگا کر اس پر ہاتھ سینکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سلیمان سیٹھ صاحب نے کرفیو کا ذکر کیا کہ صرف جامع مسجد کے ایریے میں کرفیو لگا ہے۔ یہ کرفیو تو سارے شہر میں لگا تھا اور سارے شہر کے لوگ دکھ اور تکلیف میں تھے جو روز کے کمانے والے ہیں۔ مزدوری کرنے والے ہیں۔ ایسے لوگ جو ڈھابوں میں کھاتے ہیں گھر میں کھانا نہیں بناتے ہیں۔ اگر راشن کی دوکان پر راشن پہنچ بھی جائے تو ان کو کھانا نہیں مل سکتا ہے۔ ایسے لاتعداد لوگ شہر میں ہیں۔ ابھی سیٹھ صاحب نے کہا کہ اتنا کچھ ہوا اور سرکار نے کیا اتنا کرنے کے بعد کیا۔ اگر پہلے ہی کر دیتی۔ تو اس طرح کا حادثہ نہ ہوتا۔ میں بڑے ادب سے

عرض کرنا چاہتی ہوں اگر یہ جماعتیں (اشارہ مسلم لیگ اور جن سنگھ کی جانب ہے) امام صاحب کو نہ گھیر لیتیں۔ ان کو جھگڑے میں نہ ڈالتیں۔ ان کے پیچھے نہ گھومنے لگتیں تو دلی کو یہ دکھ بھری کہانی دیکھنے کو نہ ملتی۔ آپ اس بات سے اندازہ لگائیے۔ دو کانوں کے جلنے کے بعد سیٹھ صاحب کہتے ہیں کہ یہ ہسٹری ہے۔ راز ہے۔ میں آج اس کا نام نہیں لینا چاہتی۔ جو ان کے تازہ تازہ دوست بنے ہیں۔ لیکن میں آپ سے عرض کرنا چاہتی ہوں۔ کہ اگر جامع مسجد اور جامع مسجد ایریا کی کہانی کو دیکھنا ہے تو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ کس طرح سے فرقہ پرست ایکطرف ایک زبان بولتے ہیں کس طرح سے ایک کہانی کہتے ہیں اور کس طرح سے دوسری طرف مل کر ان کو تباہ کرنے کی سوچ رہے ہیں۔

میں بڑی صفائی سے کہنا چاہتی ہوں کہ اگر اس میں (امامت کے معاملہ میں) مسلم لیگ کے ساتھی اور جن سنگھ پارٹی کے لوگ دخل نہ دیتے تو ہمارے امام صاحب کا یہ حال نہ ہوتا۔

جناب عالی! یہ صرف ۲ فروری کی بات نہیں ہے۔ میں آپ کو وہ دن بھی یاد دلانا چاہتی ہوں جس دن اجمیر کے عرس میں جانے والے لوگوں کا راستے میں کچھ جھگڑا ہوا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر یہاں دلی میں کچھ لوگ آگئے۔ اور ان لوگوں کی خوش قسمتی سے وہ ان کے ہاتھوں میں آگئے، ان کی نمائش یہاں کی گئی۔ اور جامع مسجد میں ہم نے اور سب لوگوں نے دیکھا کہ ان جماعتوں کے لوگوں نے دیکھا کہ ان جماعتوں کے لوگوں نے نعرے لگا لگا کر ہزاروں لوگوں کو جمع کر لیا۔ اور نعرے یہ لگائے کہ خون کا بدلہ خون سے لیں گے اور سارے علاقے میں گھوم گھوم کر نعرے لگائے گئے، تاکہ وہاں پر فرقہ وارانہ جھگڑا ہو (اس پر شور مچتا ہے) میں ادب سے کہنا چاہتی ہوں کہ ان بھائیوں نے اس طرح (اشتعال انگیز) باتیں کیں، تاکہ اس طرح کے حادثے ہوں۔ جہاں تک ہمارا سوال ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ جس وقت ہندوستان اور پاکستان بنا اور جس وقت خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ اس وقت بھی ہم لوگوں نے یہی کہا تھا کہ پاکستان میں چاہے کچھ بھی ہو لیکن ہندوستان میں ایسا نہیں کیا جانا چاہیئے۔ میں نے اس وقت بھی کہا تھا اور اس وقت بھی کہنا چاہتی ہوں کہ اگر (راجستھان) جے پور یا کسی اور شہر میں کوئی

فرقہ دارانہ بات ہو جائے تو کیا ان کو ایسا نعرہ لگانا چاہیئے کہ خون کا بدلہ خون سے لیں گے۔

میں ادب سے کہنا چاہتی ہوں کہ اگر جامع مسجد میں کچھ ہو جاتا ہے تو خون کا بدلہ خون سے لینے کی بات کسی کو نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ میں آپ کو اس واقعے کا بیک گراؤنڈ بتانا چاہتی ہوں پھر ۲ تاریخ کے واقعات ہوئے۔

اب یہ بات سچ ہے کہ وہاں جا کر جب میں نے دیکھا تو علاقہ کی شکل ایسی تھی جیسی کہ کسی جنگ کے بعد ہوتی ہے۔ پتھر اینٹ اور شیشے اور جو کچھ بھی ہو سکتا تھا وہاں پر پڑا تھا۔ اس کے زخمیوں کو بھی دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ان زخمیوں میں پولیس کے لوگ بھی تھے۔

جناب عالی! میں آپ سے عرض کرنا چاہتی ہوں کہ فائرنگ کس اسٹیج پر ہونا چاہیئے یا نہیں ہونا چاہیئے۔ میں اس کی اسپیشلسٹ نہیں ہوں اور نہ میں اس کی زیادہ جانکاری رکھتی ہوں۔ پر ایک بات میں عرض کرنا چاہتی ہوں کہ ۲ تاریخ کے بعد ان جماعتوں نے اور ان اخباروں نے جو کچھ شہر میں آگ لگانے کی کوشش کی اس سے ہم سبھی کے سر شرم سے جھک جانا چاہئیں۔

ابھی دعوت کی تصویریں آپ دیکھیئے۔ یہ جماعتِ اسلامی کا اخبار ہے ان کے اخبار میں بھیانک تصویر چھپی اور یہ لکھا کہ امید ہے کہ ان کی جو قربانی ہے وہ رائیگاں نہیں جائے گی یہ بھڑکانے کا کام انھوں (دعوت) نے شروع کیا جن سنگھ نے بھی کیا۔

جن سنگھ کے رویہ پر تبصرہ کرتے ہوئے شریمتی سبھدرا جوشی نے الزام لگایا کہ جن سنگھ کا رویہ ہندوستان کے مسلمانوں اور مسجدوں کے بارے میں کیا ہے اس کو میں دہرانا نہیں چاہتی جیسا کہ بسو صاحب نے ہمارے ہندوستان کا چرچا کیا پر اس کو کون نہیں جانتا کہ وہ کتنی عزت مسجدوں کی کرتے ہیں۔ کچھ ہی دن پہلے ابھی کشن گنج کی مسجد پھونک دی گئی۔

باجپائی جی نے سوال کیا۔ ”کن لوگوں نے ؟“

سبھدرا جوشی نے جواب دیا۔ "باجپائی جی" میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔"

باجپائی جی نے جواب دیا "آپ بکواس کرتی ہیں۔"

سبھدرا جوشی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔

جناب عالی! بیان آنے لگے۔ ایک کے بعد ایک، اور گھوم گھوم کر علاقے میں لوگ۔ کہنے لگے مسلمان بھائیوں سے غریب لوگوں سے کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں کیوں فکر کرتے ہو؟ اس سرکار کا مقابلہ کرنا چاہیے ہم آپ کو والینٹر دیں گے۔ ہم آپ کو پیسہ دیں گے اور گھوم گھوم کر انور صاحب نے جو جن سنگھ کے ممبر ہیں۔ یہ کہا اور ان کو مسلمانوں کو کالی پٹیاں باندھیں اور کہا ہم سوئم سیوک دینے کو تیار ہیں۔ اور آپ سرکار کا مقابلہ کرو اور کوئی پرواہ نہ کرو۔ تو گھوم گھوم کر ایک ہی زبان بولتے ہیں اور ایک ہی طرح کا کام کرتے ہیں۔ یہ فرقہ پرست لوگ! مسلم لیگ کے نیتا اور جن سنگھ کے نیتاؤں نے دونوں نے اینگلو عربک اسکول میں ایک ہی میٹنگ جا کر ایڈریس کیا اور دونوں ہی نے یہ بات کہی اور کالی جھنڈیاں اور کالی پٹیاں بانٹیں، اور یہ کہا کہ اگر ۱۴ تاریخ کو (جمعہ ۱۴ فروری) اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو ہم دونوں اس کے لئے قطعی ذمہ دار نہیں ہوں گے جن سنگھ اور مسلم لیگ دونوں ہی کے نیتاؤں نے اینگلو عربی اسکول میں جا کر ایسی تقریریں کیں۔

اس کے بعد ایک دن پہلے ہی ۱۱ فروری کو یہ حادثہ کے ظہور پذیر ہونے سے قبل مدر لینڈ نے بہت بھاری مگرمچھ کے آنسو بہائے اور اس میں (اخبار میں) یہ لکھا کہ شاہی امام جامع مسجد کو سی کلاس میں رکھا ہوا ہے، اور ان کی یہ حالت ہے۔ میں کہتی ہوں کہ اگر آپ کا بس چلے (جن سنگھ مراد ہے)، تو امام صاحب ہندوستان میں ہی نہ رہیں "سی" کلاس کی تو بات دوسری رہی۔ اس طرح کے مگرمچھ کے آنسو بہا کر انھوں نے مسلمانوں کو اکسایا۔

جناب عالی! میں تو یہی کہوں گی کہ اگر ساری دلی میں فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوئے تو میں دو کی ہی تعریف کروں گی ایک تو دلی کی جنتا کی اور دوسری دلی کے ایڈمنسٹریشن کی۔ یہ میں صفائی سے کہنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی کہ جھگڑا ہو۔ جن سنگھ کے لیڈر عتیق صاحب گھوم گھوم کر مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ رات کو تیاری کر لو۔ کلیہ پہاڑ گنج

سے آکر ہندو حملہ کرنے والے ہیں۔ اور گھروں میں تیاری کر لو اور تیار ہو جاؤ۔ مجھ کو فون کیا گیا کہ عتیق صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ حملہ ہونے والا ہے۔ میں نے کہا کہ کیا حملے کی تیاری کر سکتے ہو اور اس کا کچھ علاج نہیں ہو سکتا اور اس کو تو پولیس ہی روک سکتی ہے پھر دہشت پھیلانے والی خبریں پھیلائی گئیں کہ چاوڑی بازار پر مسلمان حملہ کرنے والے ہیں اس طرح ان دونوں جماعتوں کے کوآپریشن سے یہ کارروائی چل رہی تھی اور پھر چودہ تاریخ کو جلتے ہوئے اور ان کو آپ نے ہم سب نے دیکھا۔ اس کے پہلے بھی۔ جناب عالی میں آپ سے اور ایوان کے دوسرے اراکین سے کہنا چاہتی ہوں کہ اس واقعہ کے ایک گھنٹہ پہلے اخبار والوں اور دوسرے لوگوں کو کہہ دیا گیا کہ وہاں دنگا ہو گیا۔ فساد ہو گیا۔ آتش زنی ہو گئی اور لوٹ مار ہو گئی۔ لوگوں کو مارا ہے زیادہ یا کم مارا ہے اور اگر ادھر گولی چلانا ضروری تھا تو ادھر جنھوں نے آگ لگائی تھی پر گولی چلانے کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی گئی کیوں نہیں چلائی؟ اگر پولیس نے اس دن کارروائی کر لی ہوتی۔ آگ لگنے سے۔ یا آگ لگنے کے بعد ان کو گرفتار کر لیا جاتا۔ پکڑ لیا جاتا تو چودہ تاریخ کو دوبارہ جو ہوٹل جلایا گیا اور کوئی کارروائی ان لوگوں کے خلاف نہیں کی گئی۔ آدمیوں کو زندہ جلایا گیا اور کوئی کارروائی ان لوگوں کے خلاف نہیں کی گئی یہ بہت ہی شرم اور افسوس کی بات ہے جو کوئی بھی طاقتیں فرقہ پرست جماعتوں کے ساتھ مل کر اس طرح کی سازشوں میں شامل ہیں جو اقلیتوں کو اس طرح سے دبا کر رکھنا چاہتی ہیں۔ ان پر مظالم ڈھانے جانے میں یقین رکھتی ہیں۔ ان کو الگ کر دیا جائے اور ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔ یہ میں آخر میں کہنا چاہتی ہوں۔

یہ تھے مسجد راجونتی کے بصیرت افروز خیالات جو اقلیت کے دوشہ پر پارلیمنٹ میں پر اجمان ہیں۔

(منقول از ہفت روزہ حیات دہلی ۸ مارچ [illegible])

جامع مسجد کے المناک واقعات پر پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں۔ راجیہ سبھا اور لوک سبھا میں ۔۔ ۱۱ فروری کو بحث ہوئی۔ راجیہ سبھا میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے موقف کی نمائندگی، پارٹی کی مرکزی ایگزیکیٹو کمیٹی کے ممبر ڈاکٹر زیڈ۔ اے احمد نے کی جبکہ لوک سبھا میں پارٹی کی جانب سے اسحاق سنبھلی اور ایس۔ ایم۔ بینرجی نے جامع مسجد

کے علاقہ میں پولیس زیادتیوں کی سخت مذمت کرتے ہوئے متعلقہ حکام کے خلاف کارروائی کرنے اور حادثات کے دوران پُر اسرار آتش زنی کے واقعات کی مکمل جانچ کی مانگ کی۔

لوک سبھا میں مرکزی وزیر داخلہ برہمانند ریڈی کے گول مول بیان کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں نے واک آؤٹ کیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہر قسم کی فرقہ پرست پارٹیاں جو جامع مسجد کے المناک واقعات کے بعد سے مسلمانوں کی ہمدردی میں مگرمچھ کے آنسو بہاتی رہی ہیں اس پورے معاملہ کو محض اپنے سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کرتی ہیں ان میں سے کسی بھی پارٹی کے ممبر نے واک آؤٹ نہیں کیا۔

ذیل میں ہم راجیہ سبھا اور لوک سبھا میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کی تقریر کے اہم اقتباسات شائع کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد کی تقریر:۔

راجیہ سبھا میں، جامع مسجد کے المناک واقعات پر پولیس زیادتیوں کی مذمت کرتے ہوئے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی ایگزیکیٹو کمیٹی کے ممبر ڈاکٹر زیڈ اے۔ احمد نے اس پورے واقعہ کو بدبختانہ اور انتہائی بدبختانہ قرار دیتے ہوئے، امام عبداللہ بخاری کی گرفتاری کو فوری اشتعال کی وجہ قرار دیا۔ انھوں نے اس پر بھی اظہار افسوس کیا کہ ایک خالص مذہبی معاملے کو بعض لوگوں نے سیاسی اغراض کی تکمیل اور اپنے سیاسی جھگڑوں کو چکانے کیلئے استعمال کیا۔

ڈاکٹر زیڈ احمد نے واضح کیا کہ مذہبی معاملات انتہائی، جذباتی اپیل کے حامل ہوتے ہیں۔ ان معاملات پر لچکدار اور زیادہ پر تحمل رویہ اپنانا ضروری ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ایسے معاملوں میں لوگوں کے جذبات جلدی بھڑک جاتے ہیں۔

ڈاکٹر احمد نے کہا۔" اگر کوئی امام ہے اور امام کی حیثیت سے کام کر رہا ہے تو اس کی اندرونی سلامتی ایکٹ کے تحت اچانک گرفتاری اشتعال کا سبب بن جاتی ہے،

ہماری پارٹی کی رائے میں ان المناک واقعات سے بچا جاسکتا تھا اگر متعلقہ افراد کو یہ احساس ہوتا کہ یہ ایک انتہائی جذباتی مسئلہ ہے اور اس سے مسلم فرقہ کے جذبات بھڑک سکتے ہیں اور اس سے مسئلے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس سے مذہب اور مذہبی عمل کا سوال اٹھ کھڑا ہوگا۔ اس احساس کے بعد، جو کچھ ہوا اسے ٹالا جاسکتا تھا۔ میری رائے میں ایسے معاملات میں ہمیں آئندہ محتاط رہنا چاہیئے اور ایسے واقعات سے بچنا چاہیئے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد نے بتایا کہ بنیادی مسئلہ امامت کا ہے۔ یعنی کون امام ہو یا کسے امام کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے؟...... اس مسئلہ کو قطعی طور پر طے نہیں کیا گیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ عبد اللہ بخاری کو ۱۹۷۳ء، شاید جولائی ۱۹۷۳ تک امام کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ ان کی دستار بندی ہوئی...... میرے خیال سے دستار بندی کی رسم میں کچھ سرکاری نمائندوں نے شرکت کی......

میرے خیال سے اس دستار بندی کی بڑے پیمانے پر مخالفت نہیں کی گئی تھی۔ والد معذور تھے، اصلی امام معذور تھے اور اس وجہ سے نماز نہیں پڑھا سکتے۔ ایسی حالت میں روایت کے مطابق ان کا بیٹا امام بن جاتا ہے۔ میرے خیال میں ایسے معاملات میں مذہبی روایات کا احترام کرنا چاہیئے۔ یہ خاندان اس عہدے پر شاہجہاں کے زمانے سے مامور ہے۔ والد کے بعد بیٹے کو امام بنانا، ایک روایت بن چکا ہے۔ میری رائے میں آج اتنی تاخیر سے یہ سوال اٹھانا کہ اسلام میں وراثت جائز ہے یا نہیں، مناسب نہیں۔ اس مسئلہ پر وراثت کے جائز یا جائز ہونے کا سوال اٹھانا مناسب نہیں۔ مذہبی احکام کے علاوہ ہمیں ان احکام کی عمل آوری کے دوران فروغ پانے والی روایتوں کا بھی احترام کرنا چاہیئے

امامت کے بنیادی مسئلہ پر اظہار خیال کرنے کے بعد ڈاکٹر احمد نے اوقاف کی بد انتظامی اور اس کے غلط استعمال کا بھی تذکرہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ وقف بورڈ گروہ بندی کا شکار ہیں حکومت کو اس معاملے میں غیر جانبدارانہ انداز میں موثر مداخلت کرنی چاہیئے۔ انھوں نے کہا کہ "وقف بورڈ کی نگرانی کرے اور یہ دیکھے کہ اوقاف کا مناسب ڈھنگ سے انتظام اور اس سے ہونے والی آمدنی کو مناسب ڈھنگ سے

تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے مگر سرکار کو جانبدارانہ رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیئے مجھے خدشہ ہے کہ دلی میں وقف بورڈ کے نظام میں زبردست خامیاں ہیں۔ سرکار کو اس معاملے کی چھان بین کرنی چاہیئے۔

ڈاکٹر احمد نے وزیر ریاست برائے ریلوے محمد شفیع قریشی کی ثالث کی حیثیت سے تقرری کا خیر مقدم کیا اور امید ظاہر کی کہ شفیع قریشی اس معاملہ میں کوئی بھی فیصلہ دینے سے پہلے مذہبی رہنماؤں سے صلاح و مشورہ کریں گے اور روایتوں اور احکامات کے سلسلے میں ان کی رائے معلوم کرنے کے بعد ہی کسی نتیجہ پر پہنچیں گے،

ڈاکٹر احمد نے زور دیکر کہا کہ "کسی مناسب سمجھوتہ کو ہی ہمیں اپنا مقصد بنانا چاہیئے صورت حال کو بڑھا چڑھا کر نہیں پیش کرنا چاہیئے۔ ہمیں صورت حال کو نارمل بنانے کیلئے کوشش کرنی چاہیئے۔ بعض عناصر نے صورت حال کا استحصال کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہمارے سیاسی ڈھانچے میں ہر صورت حال کا استحصال کیا جاتا ہے..... چاہے اس رنگ کے ہوں یا اس رنگ کے، فرقہ پرست عناصر اس قسم کے دھماکوں، صورتِ حال کا استحصال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر احمد نے جامع مسجد کے عقب میں دکانوں میں لگی پر اسرار آگ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ انتہائی تشویشناک امر ہے کہ جامع مسجد کے قریب کی دکانیں جل کر خاک ہو گئیں۔ پولیس زیادتیوں کی چھان بین ہونی چاہیئے اور متاثرہ افراد کو خصوصاً جو فائرنگ میں ہلاک ہوئے ہیں ان کو اور زیادہ معاوضہ دیا جانا چاہیئے۔

ڈاکٹر احمد نے پولیس فائرنگ اور پولیس زیادتیوں کی چھان بین کے سلسلے میں کچھ اصول مرتب کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے تمام متاثرہ افراد کو مناسب ریلیف فراہم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

ڈاکٹر احمد نے اپنی تقریر کے اختتام پر محمد شفیع قریشی سے مانگ کی کہ وہ ان تمام مسائل پر دھیان دیں اور جتنی جلدی ہو سکے اس معاملہ کا تصفیہ کر دائیں۔ انھوں نے تمام لوگوں سے اپیل کی کہ وہ صورت حال کو نارمل بنانے کیلئے ہر ممکنہ کوشش کریں۔

ایس۔ ایم۔ بینرجی کی تقریر: لوک سبھا میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے دو ممبروں نے تقریر کی۔ کمیونسٹ لیڈر ایس ایم بینرجی نے بھی پولیس زیادتیوں کی مذمت کی اور سرکار سے مانگ کی وہ اس پورے معاملہ کی چھان بین کر دے۔ ایس۔ ایم۔ بینرجی نے ابتدا میں اسپیکر کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اس پردرد واقعہ پر انھیں اپنے جذبات کا اظہار کرنے کا موقعہ دیا۔

انھوں نے بتایا کہ "میں جب ۱۴ فروری کو کانپور سے واپس آیا تو کچھ لوگوں نے مجھے فون کیا کہ یہاں بہت ہی دردناک واقعہ ہو گیا ہے گولی چلی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہنواز خاں وقف بورڈ کی میٹنگ کیلئے گئے تھے۔ میں نے خود انھیں فون کیا اور پوچھا کہ وہ صحیح سلامت تو ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ معمولی بات تھی کچھ نہیں ہوا اور سارا معاملہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ میں ان سے امید کرتا تھا کہ وہ کم از کم مجھے بتائیں گے کہ معاملہ اتنا چھوٹا نہیں تھا۔۔۔۔۔ تین تاریخ کو مجھے پتہ چلا کہ بڑی بے دردی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچوں، بہنوں پر گولیاں چلائی گئی ہیں ان کو گولی کا شکار بنایا گیا۔ اس سے ہمارا سر شرم سے جھک جانا چاہیئے تھا۔ آج اگر پنڈت نہرو زندہ ہوتے تو کیا نہیں کہتے کہ "مائی ہیڈ ہینگز ڈاؤن ان شیمیم" (میرا سر شرم سے جھک گیا ہے)۔ آپ یہ بھی نہیں کہتے ہیں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۵۸ء میں جب بھنگی کالونی میں بے تحاشہ گولیاں چلائی گئی تھیں اور دو چار لوگ مارے گئے تھے۔ اور ہم لوگ کالے بلے لگا کر آئے تھے اور واک آؤٹ کرنے والے تھے تو اس شخص نے خود ہاؤس میں آکر کہا تھا کہ "مائی ہیڈ ہینگز ڈاؤن ان شیمیم" اس کے بعد ہم لوگوں میں یہ طاقت نہیں تھی کہ واک آؤٹ کرتے۔۔۔۔۔ آج بھی انسانیت کا یہ تقاضہ تھا اور ہمیں امید تھی کہ سیشن کے پہلے دن ہی کوئی بیان دیا جائے گا آپ کہیں گے کہ پولیس نے جو کچھ کیا اس پر ہمیں دکھ ہے۔۔۔۔۔

معاوضہ دینے کی بات کہی گئی ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ جو مرے ہیں یا زخمی ہوئے ہیں ان کو بھرپور معاوضہ ملے لیکن جس ماں کا لڑکا مر گیا ہے کیا اس کا بیٹا اس کو واپس مل جائے گا؟ جس کی بیٹی چلی گئی ہے کیا اس کو اپنی بیٹی واپس مل جائے گی؟ جس کا شوہر چلا

گیا ہے اس کو اس کا شوہر واپس مل جائے گا؟"

بخاری صاحب نے کچھ ایسی حرکتیں کیں۔ یہ آپ کا الزام ہے۔ جس کی وجہ سے ان کو گرفتار کرنا پڑا۔ لیکن آپ نے کس دفعہ کی تحت گرفتار کیا۔ میسا کے تحت گرفتار کیا گیا یہ میسا کا ناجائز اور غلط استعمال نہیں ہے۔ تعزیرات ہند میں پچاسوں دفعات ہیں جن کے تحت ان کو گرفتار کیا جاسکتا تھا۔ کیوں نے ان کو میسا کے تحت گرفتار کیا؟

ایس۔ ایم۔ بینرجی نے پولیس مظالم کے واقعات بیان کرتے ہوئے کہا کہ "پولیس عام لوگوں کے ساتھ درندوں کی طرح پیش آئی۔ مکانوں سے کھینچ کھینچ کر اس نے لوگوں کو مارا پیٹا..... ایس۔ ایم۔ بینرجی نے اس سلسلے میں ایک بے قصور تاجر کی گرفتاری اور پولیس اسٹیشن پر بیدردی سے پٹائی کا واقعہ بیان کیا۔ یہ تاجر کانپور سے آیا تھا اور بلیماران کے علاقے میں ٹھہرا تھا۔ ایس۔ ایم۔ بینرجی نے پولیس زیادتیوں کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ" دلی میں ہوم منسٹر رہتے ہیں، ہماری محترمہ وزیراعظم بہن اندرا گاندھی رہتی ہیں۔ وہاں ایسا دردناک واقعہ ہوگیا اور اس کے تدارک کے لئے کوئی کارروائی نہ کی جائے .... یہ ہم سب کے لئے شرم کی بات ہے۔

کمیونسٹ لیڈر ایس۔ ایم۔ بینرجی نے کہا کہ" اس واقعہ کے فوراً بعد وزیر داخلہ کو متاثرہ علاقوں میں جانا چاہیئے تھا۔ انھوں نے کہا" آپ چلے جاتے تو کم سے کم لوگ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے کہ ڈاکٹر نہیں تو کم سے کم کمپاؤنڈر تو آیا ہے۔ لوگ زار زار رو رہے تھے۔ آپ ان کی ہمت بندھا سکتے تھے۔ میں دنگ رہ گیا اس طرح کے نظارے دیکھ اور سُن کر۔ کانپور میں اس طرح سے ایک ۱۹ سال کا بچہ مر رہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا۔ میں نے اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر اس کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ میں اس کانپور کا رہنے والا ہوں جہاں پر گنیش شنکر ودیارتھی نے اپنی جان کی قربانی اس لئے دی ہے۔ ہوم منسٹر کو چاہیئے تھا کہ وہ آج ان لوگوں کی آنکھوں میں جو نمی تھی اس کو دور کرتے، ان کے زخموں پر مرہم ہی کرتے۔ وہاں جاکر دیکھتے۔

ایس۔ ایم۔ بینرجی نے اس پورے معاملہ کی جانچ کی مانگ کرتے ہوئے کہا۔" پتہ لگایا جانا چاہیئے کہ آگ زنی کیسے ہوئی۔ گولی کیوں چلائی گئی۔ کس کی یہ سازش تھی۔ کس کا اس میں راست یا بالواسطہ طور پر ہاتھ تھا۔ جو پولیس آفیسر قصوروار پائے جائیں ان کو معطل کیا جائے ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ ماس سنگھ نے جو کہہ دیا وہی صحیح ہے۔ ہم نے بہت سے کمیشن دیکھے ہیں ان میں ان لوگوں کو مقرر کر دیا جاتا ہے جو ریٹائر ہو چکے ہوتے ہیں یا تھک چکے ہوتے ہیں تین تین سال تک ان کو عہدوں پر بنے رہنے کا موقع دے دیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے میں یہ سب اس ماں باپ کے نقطۂ نظر سے کہہ رہا ہوں جس کا اکلوتا بیٹا مارا گیا ہے، اکلوتی بیٹی ماری گئی۔ اس طرح کی جو وارداتیں ہو رہی ہیں کیوں ہو رہی ہیں؟ ان کو آپ روکنے کی کوشش کریں۔

ایس۔ ایم۔ بینرجی نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا کہ" اس قسم کی وارداتوں کی وجہ سے مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس بڑھے گا" انھوں نے سرکار سے کہا" آپ مہربانی کرکے ان کی حفاظت کی کیا گارنٹی دیں۔ ان کو یقین دلایئے کہ ان کی زندگی محفوظ ہے۔"

اسحاق سنبھلی ممبر پارلیمنٹ کی تقریر:۔ لوک سبھا میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر اسحاق سنبھلی نے جنھوں نے وجے واڑہ میں پارٹی کانگریس میں شرکت کرکے آنے کے فوراً بعد پارٹی کے دوسرے ممبر پارلیمنٹ وجے پال سنگھ کے ساتھ متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا تھا۔ پولیس زیادتیوں کی سخت مذمت کرتے ہوئے پورے معاملہ کی بھرپور جانچ کی مانگ کی۔ اسحاق سنبھلی نے پارلیمنٹ میں دوسرے ممبروں کی تقریریں دھیان سے سننے کے بعد کہا کہ" اس معاملے کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کیا گیا۔" انھوں نے جھگڑے کی بنا پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ" آپ جانتے ہیں کہ جامع مسجد کی جتنی جائیداد ہے اس کا انتظام وقف بورڈ کرتا ہے۔ ان جائیدادوں سے سالانہ آمدنی لگ بھگ ۳۲، ۳۵ ہزار ہے وہ ان پر ہونے والے اخراجات برداشت کرتا ہے جو لگ بھگ ایک لاکھ ۲۰ ہزار روپیہ سالانہ ہیں۔ امام صاحب نے مسجد میں جو زینے جاتے ہیں جو مینار پر چڑھتے

ہیں ان پر کچھ ٹیکس لگا دیا فوٹو لینے والوں پر کچھ زیادہ ٹیکس دیا۔ اس سے امام صاحب کو ایک سال میں ۷۰ ہزار روپیہ کی آمدنی ہوئی ــــ یہ ہے جھگڑا۔ دنیا جانتی ہے کہ یہاں سے جھگڑے نے شدت اختیار کی۔

اسحاق سنبھلی نے بچوں کے گھر پر وقف بورڈ کی میٹنگ کو توڑنے کی نیت سے کئے گئے حملے کو غیر ذمہ دارانہ بتاتے ہوئے اس کی مذمت کی۔ مگر اس پورے معاملے میں پولیس نے جو عجیب وغریب رویہ اپنایا، انھوں نے اس کی بھی نکتہ چینی کی۔ انھوں نے کہا کہ "پولیس اگر چاہتی تو صورتِ حال کو بگڑنے سے روک سکتی تھی۔ وہ اس وقت احتیاطی کارروائی کر سکتی تھی جب امام صاحب جامع مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے مجوزہ احتجاجی مظاہرے کے بارے میں اعلان کر رہے تھے یا جس وقت وہ بچوں کے گھر کی طرف جا رہے تھے اس وقت دفعہ ۱۴۴ لگا کر معاملہ کو بگڑنے سے بچایا جا سکتا تھا" انھوں نے کہا کہ "ہجوم کے سامنے امام صاحب کو گرفتار کیا گیا۔ جامع مسجد آکر ان کے بیٹے اور دوسرے لوگوں نے اعلان کیا کہ امام صاحب کو گرفتار کر لیا گیا ہے، نہ جانے وہ کس حالت میں ہیں ــــ عوام میں غصہ پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔

اسحاق سنبھلی نے پولیس کی پوری کارروائی کو انتقام لینے کے جذبہ سے کی گئی کارروائی قرار دیتے ہوئے کہا کہ "بسو جی (مارکسی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر جیوتر موئے بسو) اور بھگت جی نے کہا کہ وہاں پتھر پھینکے گئے ...... اگر یہ صحیح ہے کہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر سے پولیس پر پتھراؤ ہوا اور فائرنگ وہاں پر ہوئی ہے تو پھر میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا وہاں کوئی لاش نہیں گری۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے کوئی لاش نہیں گری۔ ہوتا کیا ہے؟ اس کے بعد کرفیو لگایا جاتا ہے۔ بارہ بجے سے کرفیو لگا دیا گیا۔ میں سمجھ بوجھ کر الفاظ استعمال کر رہا ہوں کہ اس کے بعد ساڑھے بارہ بجے پولیس، سی۔ آر۔ پی کی کمک لے کر درندوں کی طرح محلوں پر جھپٹ پڑی۔ جامع مسجد سے ایک فرلانگ دور، دو فرلانگ دور ڈیڑھ فرلانگ دور جا کر محلوں میں کام کرتے ہوئے انسانوں پر حملہ کیا گیا۔ ایک لڑکا مٹیا محل میں شہید ہوا، جو دودھ گرم کر رہا تھا۔ ایک خونچے والا شہید کر دیا گیا۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے ایک

لڑکی فریدہ ، جامع مسجد سے ڈیڑھ فرلانگ دور خیریں بھون کی تیسری منزل پر کھڑی تھی اسے وہاں گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ مجھے بتایا جائے کہ اگر پولیس چوکی پر حملہ ہوا تھا تو فائرنگ سے لوگ وہاں کیوں ہلاک نہیں ہوئے ۔ اتنے دور کے علاقوں میں کیوں مرے ؟

میں اور میرے ساتھی وجے پال سنگھ نے اس علاقہ کا دو گھنٹہ تک دورہ کیا ، وہاں لوگوں سے بات چیت کی۔ پولیس والوں سے پوچھا ، افسروں سے پوچھا..... مجھے معلوم ہوا کہ وہاں حملہ نہیں ہوا۔ وہاں کوئی آج طرح کا نشان نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ وہاں حملہ ہوا ہے۔

اگر واقعی پولیس نے اپنے ڈیفنس میں گولی چلائی۔ پولیس والے ہمیشہ یہ گھسی پٹی دلیل دیتے ہیں ، تو گولیاں اس جگہ کیوں نہیں ملیں جہاں اس پر حملہ ہوا ؟ وہ گولیاں محلوں میں کیوں ملیں ؟

جامع مسجد کے قریب روئی اور ردی کے کپڑے کی دو دکانوں کی پر اسرار آگ کے متعلق اسحاق سنبھلی نے کہا کہ : سبھدرا جوشی اور ایچ کے۔ ایل۔ بھگت کی یہ بات مانتا ہوں کہ وہاں ایک میونسپل کونسلر آئے جو جن سنگھ کے ممبر بتائے جاتے ہیں ، چاوڑی بازار سے آر۔ ایس۔ ایس کے ورکر آئے۔ لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ پولیس وہاں کیا کر رہی تھی ۔ کیا پولیس کھڑی کھا رہی تھی۔ کیوں نہیں آگ لگانے والوں کو روکا گیا ؟" انھوں نے اس سلسلے میں اسٹیشن ہاؤز آفیسر رامی سنگھ کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ "یہ اور دوسرے ایس۔ ایچ او اس علاقے میں کرپشن اور بدتمیزی کے لئے مشہور ہیں۔ اسحاق سنبھلی نے پولیس مظالم کا بھی حوالہ دیا اور کہا کہ ۔۔ " ہماری پارٹی کی ریاستی کونسل کا دفتر بالکل جامع مسجد کے سامنے ہے ، ہمارے ساتھی کامریڈ موہن لال ، کامریڈ پرساد اور دوسرے ساتھیوں نے جو باتیں بتائی ہیں ، اگر میں ان کو دہراؤں اور پولیس کے مظالم کا حال سناؤں تو لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔"

جھگڑا بتایا جاتا ہے جامع مسجد کے سامنے اور کرفیو کہاں لگتا ہے ؟ بلیماران قصاب پورہ اور باڑہ ہندو راؤ میں ، جو وہاں سے تین تین میل دور کے علاقے ہیں ۔

ان علاقوں کا یہی قصور ہے کہ وہاں مسلمانوں کی اچھی آبادی ہے اور غریب ہندو مزدور آباد ہیں۔

کرفیو لگا کر بے قصور انسانوں کو پکڑا گیا ۲۰ فروری کے جھگڑے میں جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے ان سے جیل میں ملا ہوں، ان میں دس، بارہ اور چودہ سال کے بچے ہیں ...... کرفیو کے دوران آگ لگا کر اور گولیاں چلا کر اس علاقے کو تباہ کیا گیا ہے۔

ایک دم سے ۹۶ گھنٹے کا کرفیو لگا دیا گیا۔ ایسا کرفیو دلی میں آزادی کے بعد آج تک نہیں لگا۔

اسحاق سنبھلی نے پولیس مظالم اور زیادتیوں کے کئی واقعات بتلائے۔ انھوں نے کہا کہ "وہاں روئی کی دو دکانوں میں آگ لگی۔ ایک سردار صاحب، جو فائر بریگیڈ کے انچارج ہیں، لسٹ دیکھ کر تڑپ اٹھے اور فائر بریگیڈ لا کر آگ کو بجھانا چاہا، لیکن واہ رے امن شکوہ والی دلی پولیس! اس نے فائر بریگیڈ کو نہیں آنے دیا۔ فائر بریگیڈ کو ایک گھنٹہ بعد آنے دیا گیا جبکہ روئی اور روئی کے کپڑے کی دو دکانیں جل کر خاک ہو چکی تھیں۔"

"جامعہ ہوٹل نکڑ پر ہے۔ پولیس والے موجود رہے، پولیس چوکی موجود ہے لیکن جامعہ ہوٹل کو آگ لگ گئی ... دس آدمی بے ہوش حالت میں اسپتال پہنچائے گئے۔ اس لڑکی فریدہ کو جو دلی کالج میں بی اے کی اسٹوڈنٹ ہے، تیسری منزل پر گولی لگی۔ اس کا باپ اپنی بیٹی کے صدمہ سے ہارٹ فیل ہو جانے سے مر گیا۔ لیکن واہ رے دلی کی پولیس کی انسانیت! وہ لوگ اس کے گھر میں گھستے ہیں اس کی کل پونجی ۱۳۱۷ روپیہ صندوق سے نکال لیتے ہیں۔ ایک پولیس کانسٹیبل۔ ایک ٹائم پیس اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے یہ ہیں دلی پولیس اور دلی ایڈمنسٹریشن کے کارنامے۔"

اسحاق سنبھلی نے پولیس کے جانبدارانہ رویہ کی مذمت کرتے ہوئے کہا "حد تو یہ ہے کہ فرقہ پرست پارٹیوں کے لوگوں کو تو کرفیو پاس بڑی فیاضی سے دیئے گئے۔ لیکن دلی ضلع کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری کامریڈ موہن لال کو کرفیو پاس نہیں دیا گیا اور دیا

گیا تو صرف جامع مسجد کے علاقے کیلئے۔ میں تعریف کروں گا کامریڈ موہن لال کامریڈ پرساد اور کامریڈ مسز غلام حیدر (سکینہ حیدر) وغیرہ کی، جنھوں نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر ریلیف کا سامان تقسیم کیا اور لوگوں کی تسلی دی۔

اسحاق سنبھلی نے مزید کہا کہ "بے شک جن سنگھ۔ اور دوسری فرقہ پرست پارٹیاں اس صورت حال کا فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ لیکن میں پھر پوچھنا چاہتا ہوں کہ دلی ایڈمنسٹریشن کیا کر رہا تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پولیس سے جواب طلب کیا جائے۔ اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ پولیس نے بے گناہ لوگوں کو قتل کیا۔ رامی سنگھ اور دوسرے پولیس والوں پر دفعہ ۳۰۲ میں مقدمہ چلانا چاہیئے۔"

"قومی یکجہتی کانفرنس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جس جگہ پر ہنگامہ ہوگا وہاں ضلع حکام کو اس کے لئے ذمہ وار قرار دیا جائے گا۔۔۔

میں تعریف کروں گا اتر پردیش کے چیف منسٹر ہیم وتی نندن بہوگنا کی۔ پیلی بھیت میں ہنگامہ ہوا تو وہاں کے کلکٹر، ایس۔ پی۔ اور شہر کوتوال کو ایک دم ناک پکڑ کر باہر نکال دیا گیا۔ کیا یہ یہاں نہیں کیا جا سکتا ہے؟ ایسا ہونا چاہیئے۔

کمیونسٹ ممبر نے بارہ دری کے واقعہ کا بھی حوالہ دیا۔ انھوں نے بتایا ــــ "بارہ دری میں بچے بھوک سے تڑپ رہے تھے ــ ۹۶ گھنٹے کا لگاتار کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو دودھ میسر نہیں تھا۔ کسی طرح ایک دودھ والا آ گیا۔ بچے والے جھپٹ پڑے، لاؤ بھائی دودھ لاؤ، پولیس والے اپنی شان کے ساتھ آ گئے۔ کیا کرتے ہو، ہٹو، کرفیو ہے، ڈنڈا برسانا شروع کر دیا۔۔

لوگوں نے کہا کہ اس طرح کیوں مرا جائے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۵ بے قصوار انسانوں کو گرفتار کر لیا گیا جس میں ایک ٹی۔ بی کے مریض میں مبتلا بچہ بھی شامل ہے۔"

اسحاق سنبھلی نے جامع مسجد کے واقعات پوری چھان بین کا مطالبہ کرتے ہوئے حکام کے خلاف کارروائی کرنے کی مانگ کی۔ انھوں نے کہا کہ "ان حکام کے خلاف کارروائی کرنا انتہائی ضروری ہے ورنہ ان کے حوصلے بڑھ جائیں گے اس سلسلہ میں انھوں نے صدر

بازار کے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد کے واقعات کا حوالہ دیا۔ انھوں نے کہا "ایڈمنسٹریشن میں جو کلکٹر اور ایس پی ہیں ان کے حوصلے بڑھے ہوئے ہیں۔ صدر بازار کے فسادات میں اقلیتی فرقہ کے لوگوں کو انھوں نے بھون دیا۔ اور ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ ہاں کچھ لوگوں کو ترقی مل گئی۔ کول صاحب ایس۔ پی، اے۔ آئی جی بنا دیئے گئے۔ یہی ان کے منھ کو خون لگا ہوا ہے۔ اس لئے ہماری مانگ ہے کہ جتنے نقصانات ہوئے ہیں۔ دوکانوں کے، ہوٹلوں کے، ان کے پورے نقصانات کو سرکار برداشت کرے۔ اس لئے کہ یہ سرکار کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کی حفاظت کرے۔ اس لئے نقصانات کا مکمل معاوضہ دینا چاہیئے۔"

میں امید کرتا ہوں کہ ہوم منسٹری اُن رجعت پرست افسروں کی اس چال کو کامیاب نہیں ہونے دیگی۔ وہ کوشش کر رہے ہیں کہ لوگوں کو جمہوری اور سیکولر قوتوں سے کاٹ کر فاشسٹ اور فرقہ پرست پارٹیوں کی گود میں ڈال دیا جائے۔ ان کی یہ سازش کامیاب نہیں ہونے دی جائے گی۔

(منقول از ہفت روزہ حیات دہلی ۲ مارچ ۷۵ء)

سید احمد ہاشمی نے کہا

ڈپٹی چیئرمین صاحب — صدر صاحب نے اپنے ایڈریس میں ملک کے اندر جو لوگ ہنسا اور تشدد پھیلاتے ہیں ان کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ ہنسا اور تشدد بہت بری چیزیں ہیں ان کا بھیانک روپ تب اور بھی خوفناک ہو جاتا ہے جب تشدد اور وائلنس اقلیتوں کے اوپر ہونے لگتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس دیش کے اندر فرقہ پرست طاقتیں ہیں اور رجعت پسند اور ری ایکشنری طاقتیں ہیں جو ملک میں ایجی ٹیشن پھیلاتی رہتی ہیں۔ اشتعال پیدا کرتی ہیں۔ وہی وہ اقلیتوں پر شبخوں مارتی ہیں آگ اور خون کا دریا بہاتی ہیں ان کی عزت و جان و مال اور آبرو برباد کرتی ہیں اور ان پر یورش کرتی ہیں۔ اور امن کے خرمن میں آگ لگا دیتی ہیں تب ملک میں ایسے واقعات کے وقت پولیس کا جو کیرکٹر ہے یا پولیس جو رول ادا کرتی ہے وہ عام طور پر مناسب نہیں ہوتا۔ وہ اپنے فرائض سے پہلو تہی کرتی ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا رول

جانبداری کا ہوتا ہے۔

بسا اوقات اس کا کیریکٹر ظالمانہ کیریکٹر معلوم ہوتا ہے۔ جارحانہ کیریکٹر معلوم ہوتا ہے دشمن کی مانند کیریکٹر معلوم ہوتا ہے۔ میں مثال دوں گا ابھی دلی کے اندر جو حال میں واقعات ہوئے اس سے پہلے کانپور ریلی بھیت جگتیسوری کے واقعات ہمارے سامنے ہیں چند مہینوں کے اندر یہ جگتیسوری، بمبئی، کانپور، ریلی بھیت کے اندر واقعات ہوئے اور اس سے پہلے بھی پولیس کے بارے میں ایسی شکایتیں رہی ہیں۔ اسی دہلی شہر کے اندر ۱۰ر فروری کو جو واقعہ ہوا اس کے اندر جو پولیس کا رول آیا۔ یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ پولیس اگر صحیح طور پر اپنے فرائض کو انجام دیتی اور امن قائم کرنے کی کوشش کرتی تو خود بگڑی ہوئی صورت حال پر قابو پا سکتی تھی اور بھیڑ اور مجمع کا بغیر گولی چلائے۔ بغیر فائرنگ کئے ہوئے کنٹرول کیا جا سکتا تھا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ پولیس نے اپنے کردار کو اپنے صحیح فرض کو جس طرح ادا کرنا چاہیئے تھا اس طرح سے وہ ادا نہیں اور اس طرح جارحانہ طور پر گولیاں چلائیں۔ جس کی وجہ سے بارہ چودہ بے قصور انسانوں کی جانیں گئیں۔

میں کہتا ہوں کہ ہماری پولیس کا کردار اس ملک میں ایسا ہونا چاہیئے کہ جس کو ہم کہہ سکیں کہ یہ ہمدردانہ اور ذمہ دارانہ ہے کہ اس رول سے بے اعتمادی بے اطمینانی بہت زیادہ پیدا ہو گی۔ پولیس کے اس رول کے اندر میرے خیال میں تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں ایک بہت بڑی کمی ہے۔ ہماری پولیس کے اندر ہماری فوج کے اندر اس میں مائنرٹیز کے لوگ نہیں ہیں اس کے اندر مسلمان نہیں ہیں اس میں دوسری مائنرٹیز کے لوگ نہیں ہیں۔ اگر مائنرٹیز کے لوگ پولیس کے اندر فوج کے اندر اور دوسری سروسز کے اندر ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ پولیس جو وحشیانہ اور شرمناک کیریکٹر ادا کرتی ہے اس میں تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے اور حالت کو قابو میں لایا جا سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی معاشی اور سماجی زندگی کے اندر اقلیتوں کا جو رول جس انداز سے ہونا چاہیئے وہ رول ادا کرنے کیلئے اقلیتوں کو صحیح موقع مل سکتا ہے اگر اقلیتوں کو اطمینان کے ساتھ رہنے کا اعتماد حاصل ہو تو لیکن اگر انھیں اگر ہمیشہ یہی فکر

رہے کہ پتہ نہیں کس وقت آگ لگ جائے گی۔ کس وقت فرقہ پرست طاقتیں ماحول کے اندر آگ لگا دیں گی۔ گولیاں چل جائیں گی۔ ایسی صورت میں جس کو اطمینان نہیں ہے۔ اپنی آبرو کے بارے میں تو ظاہر ہے کہ اس ملک کے اندر جو اس کا عظیم رول ہونا چاہیئے۔ وہ ادا نہیں ہو سکتا ہے۔

میں دو باتیں اور پیش کر دوں گا۔ چیئرمین صاحب۔ اس پارلیمنٹ کے اندر ایک اور مسئلہ آرہا ہے شہری املاک کی حد بندی کا جہاں میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں وہاں اس کے ساتھ یہ بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک کے مختلف شہروں میں دہلی کے اندر کلکتہ میں بمبئی میں بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں لوگ جھگی جھونپڑیوں کے اندر رہتے ہیں اور بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کو رہنے سہنے کی سہولت نہیں، مکانات کی سہولت نہیں حکومت کو اس طرف بھی توجہ دینی پڑے گی۔ کہ ہم ایسی شکل پیدا کریں کہ ان کے رہنے کے سادھن اور ان کے رہنے کے سامان ان کے ان کے رہنے کیلئے جو سہولتیں ہو سکتی ہیں وہ سب حاصل ہوں۔ بہرحال یہ میں نے تھوڑی سی گذارشیں آپ حضرات کے سامنے رکھیں ہیں اور ان گذارشات کے ساتھ صدر صاحب کے ایڈریس پر شکریہ کی قرارداد کی پھر تائید کرتا ہوں اور اپنا شکریہ ادا کرتا ہوں،

(منقول از اخبار الجمعیتہ مورخہ ۱۳ مارچ ۷۶ء)

عبدالباری ایم اے

جامع مسجد دہلی کے علاقے کی فائرنگ

ایک تحقیقی جائزہ عوام کی بارگاہ میں

مورچہ نمبر ۱ پولیس چوکی کی چھت کا مورچہ سب سے اہم مورچہ تھا اور اسے کمانڈ پوسٹ کی حیثیت بھی حاصل تھی کیونکہ یہیں سے ہر طرف مجمع پر کنٹرول کیا جا رہا تھا۔ یہ چوک کی سڑک سے تقریباً ۱۴ فیٹ اونچائی پر ہے اس کا محل وقوع بالکل ویسے ہی جیسے شیر کے شکار کے لئے جنگلوں میں شکاری اونچائی پر اپنا مچان بناتے ہیں۔ اس چوک کے نیچے

ہی مجمع سڑک پر پھیلا ہوا تھا اور بالمقابل جامع مسجد کی ۳۲ سیڑھیاں ہیں جن کی اونچائی بھی مجموعی تقریباً ۱۶ فیٹ ہو جاتی ہے اور پھر جامع مسجد کا جنوبی گیٹ کا نچلا حصہ گویا چوکی کے چھت کے لیول میں آجاتا ہے اور گیٹ کی اونچائی کسی طرح ۱۵ فیٹ سے کم نہیں۔ اس طرح پورا گیٹ اس کے دونوں بازو اور برآمدے کے دریچے (گو دو سو فیٹ کے فاصلہ پر ہوں گے) صاف چوکی سے نظر آتے تھے۔ گیٹ کے دونوں پیتل کے پٹے فائرنگ کے وقت حفاظت کے لئے بند کر لئے گئے تھے۔ حالانکہ سیڑھیوں کے بیچ بیچ سڑک پر متعدد دوکانوں کی قطار ہے مگر وہ سب چوکی کی چھت سے جامع مسجد کے گیٹ کو نشانہ بنانے میں حائل نہیں ہو سکتی تھیں اس لئے کہ نشانہ کی لائن سے یہ نیچے پڑتی ہیں ،

جامع مسجد کے جنوبی گیٹ پر فائرنگ کے جو صاف اور واضح نشانات موجود ہیں وہ اس طرح ہیں۔

- گیٹ کے بائیں طرف (پچھمی بازو میں) ۵۲ ½ فیٹ پر۔
- دوسرا نشان ۱۱ فیٹ کی اونچائی پر پہلے نشان کے اوپر اسی لائن میں ۔
- تیسرا نشان محراب کے اوپر مغربی گوشہ میں
- چوتھا نشان گیٹ کے دائیں طرف تقریباً ۱۲ فیٹ کی اونچائی پر ۔
- پیتل کے دروازے کی طرف منہ کرنے سے داہنے پلے میں ۴ فیٹ کی اونچائی پر نشان ۔
- پیتل کے دروازے کے بائیں پلے میں ½ ۲ فیٹ کی اونچائی پر ایک گہرا نشان (سائز ½ ۱" × ½" × ¾ ۱")
- پیتل کے دروازے کے بائیں پلے میں ½ ۷ فیٹ کی اونچائی پر ایک نشان ۔
- پیتل کے دروازے کے بائیں پلے میں ۱۱ فیٹ کی اونچائی پر ایک نشان ۔
- پتھر کی سولہویں سیڑھی پر ایک گہرا نشان (سائز: قطر ¾ ۱ اور گہرا ½ ۰) جہاں بہا ہوا خون بھی جم گیا تھا۔ تین شہادتیں بھی اسی مورچہ سے ہوئیں
- فقیر محمد (عمر ۱۷ سال، طالب علم، اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول) ولد شفیع محمد

کتابیں خریدنے آرہا تھا کہ ہنگامہ شروع ہو گیا سیڑھی پر گولی لگی۔ لوگوں کا بیان ہے کہ مسجد میں لیجانے کی لوگوں نے کوشش کی تو اس لڑکے نے کہا کہ جائیے پہلے دوسرے بھائیوں کی مدد کیجیئے۔ پھر اس نے دوسرے زخمی کو لے کر خود مسجد کے اندر پہنچایا اور پھر مدد کیلئے باہر آیا کہ دوسری گولی لگی۔ پھر کسی کو لے کر پہنچایا اور تیسری بار آیا تو پھر گولی لگی۔ اس طرح کم از کم تین گولیاں لگیں (اور مسٹر جیوتی مورے باسو نے تو ۷ گولیاں بتائی ہیں)

• سید اقبال شاہ (عمر: ۲۳ سال) ولد سید احمد شاہ، اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ٹھیلہ پر خشک میوہ بیچ رہے تھے۔ فائرنگ کے وقت جان بچانے کی غرض سے دونوں بھائی جامع مسجد کی سیڑھیوں ہی پر تھے کہ ان کی بائیں پسلی میں گولی لگی۔ زخمی ہو کر مسجد کے اندر داخل کئے گئے اور وہیں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

• محمد نعیم (عمر ۲۴ سال جن کی شادی تین ہفتے قبل ہی ہوئی تھی) ولد محمد ابراہیم اپنی دوکان (موٹر پارٹس نزد جامع مسجد ڈاک خانہ) سے کھانا کھانے کیلئے اپنے گھر گلی گوکل شاہ آرہے تھے کہ گلی کبابیان (داخلہ برائے کریم ہوٹل) ہی کے پاس جب مڑ کر پیچھا دیکھا تو چوکی کی چھت سے (جو تقریباً پچاس ساٹھ فیٹ کا فاصلہ ہو گا) گولی کا نشانہ بن گئے اور دہیں نئی دلہن کا سہاگ لٹ گیا۔

ان شہادتوں کے علاوہ تین افراد کے زخمی ہونے کا سراغ ملتا ہے۔

• رفیق احمد ولد نیاز احمد (یہ آٹو رکشا چلاتے تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر دو گولیاں لگیں۔ ایک (شادی شدہ) داہنے ہاتھ کی ہتھیلی پر۔ دوسری اس بازو میں۔ اسپتال میں ہاتھ کاٹ دیا گیا ہے۔

• صفدر ولد کلیم الدین مرحوم (بولیس چوکی کے قریب ظفر ہوٹل میں ملازم تھا) دوکان بند نہ کر سکے تھے کہ پتھراؤ ہونے لگا۔ ظفر ہوٹل والے تو اپنے گھر بھاگ گئے۔ یہ لڑکا رہ گیا تھا۔ جامع مسجد کی طرف بھاگ رہا تھا کہ پانچویں چھٹی سیڑھی پر پیچھے سے گولی لگی۔ بائیں جانگھ میں۔ اسپتال میں داخل ہوئے تھے۔

• حبیب ولد ریاست حسین (ساکن الہ آباد) جامع مسجد اسٹینڈ پر رکشا چلاتا تھا۔

رکشا ہی پر سو جایا کرتا تھا۔ ہنگامہ میں رکشا چھوڑ کر مسجد کی طرف بھاگ رہے تھے کہ ان کی جانگھ میں گولی لگی تھی۔

مورچہ نمبر ۲ یوں تو منارٹ پارک میں پولیس کا دستہ ایسے مواقع پر تعینات ہی کر دیا جاتا ہے مگر اس حادثہ کے روز ۲ ر فروری کو اس مورچہ نمبر ۲ سے مسلح فورس جامع مسجد کے مشرقی گیٹ کے دامن کو اور مچھلی مارکیٹ تک کنٹرول کر رہی تھی۔

• چنانچہ اس مورچہ سے ایک بار جامع مسجد کے مشرقی گیٹ ملحق جنوبی برآمدے میں تیسرے کھلے ہوئے در یچہ پر آدمیوں کو کھڑا دیکھ کر پولیس نے ایک فائر داغ ہی تو دیا اور ایک شخص محمد رفیق نامی کے سر کے اوپر سے اتفاقیہ وہ گولی صحن کی فضائے بسیط میں پار ہو گئی۔ اس طرح وہ بال بال بچ گئے۔

• اسی طرح اردو بازار روڈ پر سامنے ہی مسجد احمد سعید کی طرف بھی فائرنگ کا رخ اسی مورچہ سے ہوا جس کے نتیجے میں تین فائرنگ کے نشانات نظر آتے ہیں۔ ایک چھوٹے اس مینار کا کلس ٹوٹ کر گر گیا جس میں لاؤڈ اسپیکر کے دو ہارن بندھے ہوئے ہیں۔ گنبد منڈا ہو گیا۔

• دوسرے مینار کے گنبد کی گردن میں گولی لگتی ہوئی فضا میں نکل گئی اور صرف پلاستر اکھڑ گیا۔

• تیسرے مینار میں بھی اندر پچھمی رخ پر گولی لگتی ہوئی چلی گئی ہے جس کا نشان موجود ہے۔

• مچھلی مارکیٹ ہی کی طرف اسی مورچہ کے مسلح پولیس نے حرکت کر کے ایک شخص عبدالحمید نامی کو نشانہ بنایا جس کے سر پر لگتی ہوئی گولی پار چلی گئی اسے اسپتال میں داخل ہونا پڑا تھا۔

• مسجد احمد سعید کے سامنے مینا بازار کو نیچے جانے کیلئے جو پختہ زینہ ہے۔ اس کے ذریعہ ایک شخص محمد رفیق ولد سلطان کی ایک دوکان نمبر ۲ ہے جہاں وہ اتوار مارکیٹ

سے فرنیچر اٹھا کر پہونچا رہا تھا۔ کہ اس اثنا میں زینہ پر پیر رکھا ہی تھا کہ پولیس کی گولی پیچھے سے پیٹھ میں لگی اور پسلی میں جا کر پھنس گئی تھی۔ اسپتال میں بہت دنوں تک پڑے رہے اور آپریشن کرکے گولی نکالی گئی۔

● اسی مورچہ کے کسی سپاہی نے ایک شخص محمد صابر ولد ریاست حسین کو بھی نشانہ بنایا جن کے پیٹ میں گولی رہ گئی تھی اور آپریشن کرکے اسپتال میں نکالی گئی۔ یہ ۱۲ بجے کے قریب مولانا آزاد کے مقبرہ کے پاس کھڑے تھے اور ارادہ کر رہے تھے۔ کہ جامع مسجد میں مشرقی گیٹ (شاہی گیٹ) سے داخل ہو کر نماز پڑھ لیں کہ یکایک فائرنگ شروع ہو گئی۔ لوگوں نے انھیں جانے سے روک دیا۔ مسجد کی طرف منہ کرکے کھڑے ہی تھے کہ سامنے سڑک کی طرف سے گولی آکر پیٹ میں لگی۔

مورچہ نمبر ۳

مٹیا محل روڈ پر چلتی پھرتی مسلح پولیس کا سخت پہرہ ہو گیا تھا پہرہ تو اس لئے ہوتا ہے کہ آبادی کی حفاظت ہو۔ یا بازار کی بھیڑ کو منتشر کر دیا جائے مگر ایسا نہ کرکے معصوم لوگوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔

● نوجوان سلطان محمود (عمر ۱۷ سال) ولد عبد الکریم یہ بھی آ رہے تھے کہ غریب ہوٹل کے پاس ہی انھیں بھی خواہ مخواہ گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ اور شہید ہو گئے۔

● ذرا اور آگے گلی گڑھیا کے داخلہ سے پولیس نے سیدھی گلی میں فائر کر دیا۔ گلی تو پانچ چھ فیٹ سلوپ ہو کر گئی ہے۔ تقریباً دو سو فیٹ پر گلی کا موڑ ہے۔ جہاں ایک چھوٹی سی دوکان کے اوپر کونہ کی دیوار پر نشانہ لگا اور نشان موجود ہے۔ سلوپ ہونے کی وجہ سے کسی آدمی کو گولی نہیں لگی۔

● دوجانہ مسجد کے قبل ہی سڑک کی پورب جانب انڈین ریسٹورنٹ کے سامنے فٹ پاتھ پر ایک معصوم لڑکے کو سڑک کی پچھم جانب سے (یعنی پچیس فیٹ کے فاصلے سے) پولیس نے خواہ مخواہ فائر کر دیا اور وہ زخمی ہو کر چوڑی والان کی طرف بے تحاشہ بھاگا۔ اس کے زخم سے بڑی کثرت سے خون بہا تھا۔

● ایک سوشل ورکر جناب مولوی واثق صاحب دوجانہ مسجد کے سامنے بھرا ڈ

والے مجمع کو ہٹانے اور پر امن رہنے کی اپیل کر رہے تھے، سڑک کی پولیس نے موصوف کو متحرک دیکھ کر فائر کر دیا۔ ایک گولی بائیں ہتھیلی پر لگی۔ دوسری گردن میں لگ کر جبڑے میں پھنس گئی تھی۔

مورچہ نمبر ۴

مٹیا محل روڈ سے گلی گڑھیا میں داخل ہوتے ہی داہنی طرف مکان نمبر ۳۵۸ ہے۔ جس کی سیڑھی پر پولیس چڑھ گئی۔ پہلی منزل پر پہونچ کر چھوٹی آنگن سے ایک معمولی سا زینہ بالائی منزل کے پچھم کی طرف ایک چھوٹے کمرے تک جاتا ہے اس پر چڑھی اور دروازے کو توڑ ڈالا جس میں لڑکے تھے۔ ایک دروازہ کھلی چھت پر کھلتا ہے اور وہ کھلی چھت آنگن کے تین طرف ہے کمرہ کے دکھن کی طرف سامنے ہی محض دس فیٹ کے فاصلے پر فضل حسین عرف کالو (عمر تقریباً ۲۴ سال) ولد تاج الدین ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے تھے جب وہ کھڑے ہو کر دیوار پھاندنا چاہتے تھے کہ سامنے والے زینہ سے پولیس کی نظر پڑی جس نے دو فائر کئے۔ ایک گولی کمرے میں لگی اور دوسری کندھے پر۔ بیچارے وہیں پر ڈھیر ہو گئے وہ تین لڑکے اسی دیوار کو پھاند گئے اور جان تو انھوں نے اپنی بچا لی مگر معلوم ہونا چاہیئے کہ دوسرے گھر کی آنگن ۲۰ فیٹ سے زیادہ نیچے تھی جس کی وجہ سے بیچاروں کی ٹانگوں میں چوٹیں آئیں اس طرح جان پر کھیل کر جان بچائی! چھوٹی کوٹھری سے تین چار لڑکوں کو زدوکوب کرنے کے بعد پولیس گرفتار کر لے گئی۔

اس کے بعد پہلی منزل پر پولیس اتری۔ چھوٹی آنگن سے ملحق ایک چھوٹا کمرہ تھا جس میں خواتین چھپ گئی تھیں۔ زبردستی بوٹوں سے ٹھوکر مار مار کر دروازہ توڑا (آج تک دروازے پر بوٹ کے نشان موجود ہیں) عورتوں کو ہٹا کر تمام برتن وغیرہ دیئے۔ اور چاندی سونے کے کافی زیورات لوٹ کر لے گئے۔ زیورات کی مالیت دیکھ کر ان کی آنکھیں اتنی چکا چوند ہو گئیں کہ جس طرح افسانوی علی بابا بھائی "سم سم کا دروازہ کھل جا" والا نسخہ بھول گیا تھا اسی طرح پولیس بدحواسی میں اپنی حفاظتی بیداری

ڈھال اسی گھر میں چھوڑ کر چلی گئی تھی! جسے بعد میں لے گئی!

مورچہ نمبر ۵ بازار حتیلی قبر بقائی کلینک والی گلی کا جنکشن پولیس کا ایک مورچہ بنا۔ سیف الدین اسٹور کے سامنے

- اسی مورچہ سے شیریں بھون مسجد کی شمالی دیوار پر دو گولیاں ماری گئیں دونوں نشان موجود ہیں۔

مورچہ نمبر ۶ بازار حتیلی قبر مسجد شیریں بھون کے سامنے کسی دوکان کا چبوترہ چھٹا مورچہ بنا۔

جہاں سے حکیم شریف الدین صاحب بقائی کے بند مطب کو نشانہ بنایا گیا۔ چا نشانات موجود ہیں جن کا قریبی مطالعہ بتاتا ہے کہ تین گولیوں سے یہ چار نشان آئے تھے۔

- ایک گولی سیدھے جنوب مشرقی گوشہ میں لکڑی کے دروازے پر لگی جسے سوراخ کرکے پار ہوئی اور الماری کے شیشے کو توڑ کر دواؤں کے ساتھ الماری کے اوپری خانہ میں بیٹھ گئی۔
- دوکان مطب کے شمال مشرقی سمت میں ٹین کا شٹر گرا ہوا تھا۔ دوکان کے فرش سے تقریباً ۵ فیٹ اوپر ایک نشانہ لگا۔ اور سوراخ کر دیا۔
- اسی نشانہ سے ذرا اوپر دوسری گولی لگی اور دوسرا سوراخ بھی ہو گیا۔ یہ گولی شٹر سے بلائی ڈڈ کی چھت کے سفید زنگ کو خراش کرتی ہوئی گئی!

مورچہ نمبر ۷ بازار حتیلی قبر اشتیاق احمد صاحب کے مکان نمبر ۳ ۱۹ ۲ کی چھت پولیس کا ساتواں مورچہ بنا کس طرح یہ مورچہ بنا اس کی داستان بھی عجیب ہے۔

مورچہ نمبر ۵ کے قریب سڑک کے کنارے حاجی نادر علی صاحب کا ہوٹل ہے جس کا زینہ سڑک ہی پر ہے۔ دروازہ نہیں چنانچہ پولیس اس زینہ پر چڑھ کر زبردستی مکان کی چھت پر پہونچ گئی۔ ادھر ادھر فائر کرتی ہوئی بغل کے ڈوائی کلینک کی چھت پر

چارپائی کھڑی کر کے پہونچ گئے۔ چھت پر پہونچتے ہی آبادی کی دنیا چاروں طرف نظر آنے لگی۔ چنانچہ اس نے چھت کے ایک موزوں مقام کو مورچہ بنالیا۔

• وہیں سے سڑک پار فریدہ کے مکان نمبر ۱۴۸۹ کے شمالی حصہ والی چھت پر گولی ماری جس نے لوہے کی فولڈنگ کرسی کے پشت والے ٹین کو سوراخ کر دیا۔

• دوسری گولی اسی گھر کے نچلے حصہ (جو ماڈل ڈرائی کلینرز کی تحویل میں ہے) اس کے زنان خانہ میں جھانک کر ماری جس کا نشان دیوار پر موجود ہے۔ کمرہ میں خواتین پناہ گزیں تھیں۔

• اسی مورچہ کے بالمقابل سڑک پار تقریباً تیس چالیس فیٹ کے فاصلہ پر سیف الدین (عمر ۴۳ سال) ولد اسلام الدین اپنی دوکان سے چھت پر لکڑیاں رکھنے کی غرض سے چڑھے تھے۔ ان کا منہ اتر کی طرف تھا۔ پچھم رخ سے مورچہ نمبر ۷ سے گولی ان کی کنپٹی پر لگی۔

• دروازہ توڑتے ہوئے چھت سے نیچے اترے اور ڈرائی کلینرز فیکٹری کے پناہ گزینوں کو زدوکوب کرتے ہوئے دوکان کا شٹر کھلوایا اور تین آدمیوں کو گرفتار کر کے باہر نکل گئے۔

مورچہ نمبر ۸ بازار چتلی قبر کا معروف چوراستہ آٹھواں مورچہ بنا جہاں سے ہر سمت کی گلی دکھائی دیتی ہے۔ یہ چوراستہ عام دنوں میں بھی پولیس کا اڈہ رہتا ہے۔ اس حادثہ کے دن تو یہ بہت ہی مستعدی سے کام کر رہا تھا۔ اس چوراستہ سے داہنی طرف ایک پتلی گلی تقریباً دس فیٹ چوڑی چتلی قبر ہوتی ہوئی ترکمان گیٹ کی طرف جاتی ہے۔ بائیں طرف اس سے بھی پتلی گلی حویلی اعظم خاں کو جاتی ہے۔ جب پولیس نے آنسو گیس چھوڑی اور لاٹھی چارج کیا تو لوگ منتشر ہو کر اپنے گھروں کی طرف انھیں گلیوں سے بھاگ رہے تھے۔ لیکن انھیں بھاگنے کا موقع بھی نہ دیا گیا اور فائرنگ شروع کر دی گئی۔

• ترکمان گیٹ کی طرف جانے والی گلی میں چوراستہ سے تقریباً ۸ فیٹ پر

ٹیلی فون کا کھمبہ نمبر ۰۳-۱۷ ہے (قلعی والی موٹی ٹین کی پلیٹ کا بنا کھوکھلا) کھمبہ سے ملحق مورچہ کے رخ پر تانبہ برتن کی دوکان نمبر ۵۰۳-۲ ہے جس کے مالک عارف صاحب ولد محمد صابرین صاحب خود موجود تھے۔ کھمبہ کی آڑ میں ملحق مسجد کا دروازہ ہے۔ عارف صاحب دوکان بند کرنے کیلئے کھمبہ کی آڑ میں دروازے کا پٹ کھسکانے اُٹھے تھے کہ گولی کھمبہ میں لگی اور یہ بال بال بچ گئے گولی کا نشان موجود ہے۔ ½ ۱ انچ قطر کا سوراخ سڑک سے ۶ فیٹ اوپر ہے۔ کھمبہ کی سامنے والی ٹین پلیٹ کو گولی پار کر گئی۔ اور اس کا زور ختم ہو چلا تھا۔ دوسری جانب بھی دھکا مارا اور نشان ہے مگر پار نہ ہو سکی۔ ظاہر ہے کہ اس کھوکھلے کھمبہ کے اندر ہی پار بھی ہو جاتی تب بھی عارفین صاحب کے سر سے اوپر نکل جاتی۔!

- اسی گلی میں اسی مورچہ سے اسی زاویہ سے کسی اور شخص کو گولی کا نشانہ خطا کر گیا۔ اور وہ گولی تقریباً دو سو فیٹ سے زائد فاصلہ پر وصی الدین صاحب کی دوکان (نیو لائٹ جنرل اسٹور) میں لٹکے ہوئے بڑے سائن بورڈ کے آخری حصہ میں لگی اور ½ ۱ x ۲ انچ کا سوراخ لمبائی میں بناتی ہوئی ٹین کو پار کر گئی۔ یہ نشان سڑک سے ۱۱ فیٹ اوپر ہے۔

- اسی گلی میں تانبہ برتن کی دوکان سے ذرا آگے ڈاکٹر سعید احمد علوی صاحب دندان ساز کی دوکان کے سامنے اعجاز الدین (عمر ۴۲ سال) ولد شجاع الدین کو پیچھے سے اسی مورچہ سے بائیں ران میں گولی لگی وہیں گر گئے اور اسپتال میں داخل کر دیئے گئے تھے۔ گولی ہڈی توڑ کر پار ہو گئی تھی۔

- حویلی اعظم خاں والی گلی میں داخلہ سے تھوڑی ہی دور حلوائی کی دوکان کے سامنے ایک لڑکا احسان الحق (عمر ۱۸ سال) ولد محمد رفیق مرحوم اپنے گھر کی طرف پناہ لینے کی غرض سے بھاگ رہے تھے کہ پیچھے سے گولی ان کے داہنے پیر کے پنجہ پر لگی اور یہ زخمی حالت میں بھی بھاگ گئے۔

- اسی چوراہے سے تقریباً ایک سو آگے سوئی والان گلی سے تھوڑا آگے

بائیں ہاتھ پر ڈی سی ایم کی دوکان کے دفتر ہیں پھر دوسری کپڑے کی دوکان کا تیسرا نمبر ہے اس پر سڑک سے تقریباً ۸ فیٹ اونچائی پر گولی کا ایک نشان ہے۔

• اسی دوکان کے باہر بغل میں ایک اور الماری رکھی ہوئی ہے جس کی پشت پر ٹین کی چادر ہے اس پر بھی ایک گولی لگی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پولیس کے آدمی نے کسی کو کرفیو کے دوران نشانہ بنانا چاہا مگر وہ بچ گیا۔

مورچہ نمبر ۹ مورچہ نمبر ۹ اہم ترین مورچہ تھا اس مورچہ کو ہم تین مورچوں کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں جو ایک ہی مکان نمبر ۶۸۹ کے تین قطعات کی چھتوں اور آنگنوں میں ڈرامائی انداز میں آناً فاناً بنائے گئے۔

بازار چتلی قبر کے معروف چوراستہ پر حکیم بقائی صاحب کے مطب کے سامنے سڑک ہی پر مکان ۶۸۹ ہے نچلے حصے دوکانوں کی شکل میں کرائے پر اٹھے ہوئے ہیں بالائی منزلوں پر کرایہ کی رہائش گاہیں ہیں جہاں پہونچنے کے لیے ایک پختہ زینہ سڑک ہی پر ہے جس میں کوئی دروازہ بھی نہیں ہے۔ پہلی منزل پر ایک قطعہ رہائش کا داہنی طرف ہے دوسرا قطعہ بائیں جانب اور تیسرا قطعہ ذرا سامنے جاکر داہنی طرف۔ ان تینوں رہائش گاہوں کیلئے الگ الگ دروازے ہیں۔

پہلے قطعہ میں داہنی طرف دروازہ کھلتے ہی ایک صحن ہے صحن سے ملحق ایک کمرہ تقریباً ۱۰×۲۰ کا ہے جس کی دو فیٹ چوڑا پارچہ چلمن دار سڑک کی جانب ہے۔ اس میں فریدہ (طالبہ دہلی کالج) کے ماموں (نور صاحب) رہتے ہیں اسی صحن سے ایک معمولی سیڑھی دوسری منزل پر جاتی ہے اور بیچ والے کمرہ کی کھلی چھت آنگن بن گئی ہے جس میں جنوب کی طرف ایک مختصر سا کیبن ۷×۱۰ ہے جو رہائش گاہِ فریدہ ہے۔

دوسرے قطعہ میں بھی بائیں طرف ایک کمرہ ہے جس کے اوپر دوسری منزل میں بھی کھلی چھت ہے جس میں شمالی کی طرف ایک مختصر سی کوٹھری ہے اس قطعہ میں الیاس صاحب اور شہاب الدین صاحب رہتے ہیں۔ اتفاق سے حادثہ کے دو

روز قبل ایک صاحب محمد رشید (بھائی کلو کے ماموں) اسپتال میں برائے آپریشن داخل تھے اور حادثہ کے دن محمد الیاس صاحب (کلو کے بہنوئی) اور محمد شریف (کلو کے بھائی) وغیرہ محمد رشید کو دیکھنے اسپتال گئے ہوئے تھے۔

تیسرے قطعہ میں ذرا آگے بڑھ کر داہنی طرف دروازہ کھولتے ہی ایک صحن ہے پھر ایک کمرہ۔ اس صحن سے نچلا حصہ زنان خانہ کا بھی دکھائی دیتا ہے اور اوپر جانے کے لئے ایک معمولی سیڑھی ہے۔ یہ رہائش گاہ ایک کلاتھ مرچنٹ بھائی کلو صاحب کی ہے۔ جو بازار چتلی قبر میں فٹ پر دکان لگاتے ہیں۔ یہ اتفاق سے حادثہ کے ایام میں بمبئی گئے ہوئے تھے اور گھر پر صرف خواتین ہی تھیں۔

● دن دہاڑے پولیس مکان نمبر 689 کے زینہ پر چڑھی پہلے قطعہ کے پہلی منزل کے دروازے کو دھکا مار کر کھولا اور آنگن کے جنوب مشرقی دیوار کی طرف کسی کو مارنے کی کوشش کی نشانہ خطا کر گیا گولی کا نشان مکان نمبر 697 (حویلی اعظم خاں) کی دیوار پر موجود ہے اس فائر کے بعد فریدہ کے ماموں (نور صاحب) کے کمرے کے دروازے کو دھکا مار کر کھولا جس میں خواتین پناہ گزیں تھیں۔ پھر پولیس کے لوگ دوسری منزل پر چڑھ گئے۔ اور فریدہ کو اس کے کیبن میں پایا۔ لوٹ مار کرنے کے ساتھ ساتھ اس بیچاری کو کتنی قریب سے (کہ کیبن کا اندرونی فرش آنگن سے مشکل سے۔ ایفٹ کے فاصلہ پر ہوگا) گولی کا نشانہ بنایا کہ اللہ کی پناہ! گولی بائیں جانب پشت سے کوکھ میں لگی اور پسلی کی ہڈی کو چٹخاتی ہوئی پیٹ کی طرف سے پار ہوگئی۔ چادر خون سے شرابور ہوگئی۔ لڑکی کو بیہوشی کے عالم میں چھوڑ کر وہاں سے پولیس نیچے اتری۔

اور دوسرے قطعہ کی بالائی منزل پر پہنچی چھوٹی کوٹھڑی میں خواتین پناہ گزیں تھیں۔ انھیں دھونس دی اور شہاب الدین کی اہلیہ کے سینہ پر کافی دیر تک ریوالور یا مارالکفل کی نلی رکھی۔

واضح رہے کہ اس دوسرے قطعہ کی بالائی منزل میں وہ لوہے کی فولڈنگ کرسی

تھی جو سڑک پار دوسرے مکان کی چھت (مورچہ نمبر ۷) سے گولی کا نشانہ بنی تھی۔

- یہاں عورتوں کو کچھ بک جھک کر پولیس تیسرے قطعہ کی طرف داخل ہوئی وہاں بھی کمرے کے دروازے کو دھکا دیکر کھولا تو عورتوں نے شور مچایا اتنے میں پولیس نے جھانک کر نیچے کے زنان خانہ کی طرف دو فائر کئے۔ پھر بالائی منزل پر چڑھے وہیں سے فریدہ کے بالائی کیبن کے بغل والے مشرقی مکان 697 کی بالائی چھت (برساتی) پر نوجوان نواب (عمر ۲۰ سال) ولد محمد سعید کو گولی کا نشانہ بنایا۔ جی دار نوجوان گرمجوشی میں پہلی منزل میں اتر کر شہید ہوا پولیس اسے گھسیٹ زینہ کے نیچے لائی جو حویلی اعظم خاں گلی کے داخلہ پر آتا ہے۔ غرضیکہ یہ ہے فائرنگ کی داستان جس کے متعلق حکومت کا بیان صفائی یہ ہے کہ ضرورتاً اور مجبوراً پولیس نے ۲۶ راؤنڈ فائرنگ ضرور کی تھی؟ اس مسلّم ۲۶ راؤنڈ میں کہاں تک صداقت ہے اس کا تجزیہ کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔

پولیس نے واقعی کتنی راؤنڈ گولیاں چلائیں؟

کسی نے کہنے پر کیوں جائیے؟

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟ فائرنگ کی تفصیلات سے خود ہی تحقیقی جائزہ کر کے حساب لگا لیجئے۔

مورچہ نمبر ۱ سے — ۱۰ فائرنگ کے نشانات جامع مسجد کے گیٹ اور سیڑھی پر۔

۵ فائرنگ سے ۳ افراد شہید ہوئے تھے (جن میں فقیر محمد پر کم از کم ۳ فائرنگ ہوئی اور جیو تو موئے باسو کے بیان کے مطابق ۴ کا اضافہ ہوجائے گا۔

۴۔ فائرنگ سے ۳ افراد زخمی ہوئے (جن میں ایک مجروح رفیق احمد کو دو گولیاں لگیں)

مورچہ نمبر ۲ سے — ایک فائرنگ سے جامع مسجد کے برآمدہ کو پار کر کے فضا میں گولی چلی گئی۔

۲- فائرنگ کے نشانات مسجد احمد سعید کے میناروں پر۔
۳ فائرنگ سے تین افسراد زخمی ہوئے تھے۔

مورچہ نمبر ۳ سے | ۱ فائرنگ سے ایک لڑکا مجروح ہوا۔
| ۱ فائرنگ سے ایک لڑکا شہید ہوا

۱ فائرنگ سے گلی گڑھیا کی ایک دوکان کے اوپر دیوار پر گولی کا نشان

مورچہ نمبر ۴ سے | ۲ فائرنگ سے ایک لڑکا شہید ہوا۔

مورچہ نمبر ۵ سے | ۲ فائرنگ سے مسجد شیریں کھون پر دو نشانات۔
| ۲ فائرنگ سے ایک شخص مجروح ہوئے۔

مورچہ نمبر ۶ سے | ۳ فائرنگ سے چار نشانات (حکیم بقائی صاحب
| کے مطب پر)

مورچہ نمبر ۷ سے | ۱ فائرنگ سے مکان نمبر ۶۸۹ کے دوسرے قطعہ کی چھت
| پر کرسی میں سوراخ ہو گیا تھا۔

۱ فائرنگ سے ماڈل ڈرائی کلینرز کے ایک زنان خانہ کی دیوار پر گولی
کا نشان۔

۱ فائرنگ سے سیف الدین شہید ہو گئے تھے۔

مورچہ نمبر ۸ سے | ۱ فائرنگ سے ٹیلی فون کھمبہ پر نشان
| ۱ فائرنگ سے سائن بورڈ پر نشان

۲ فائرنگ سے دو افراد مجروح ہوئے
۱ فائرنگ سے ایک لڑکا شہید ہوا
۲ فائرنگ کے نشان تنتر اور الماری پر

مورچہ نمبر ۹ سے | ۱ فائرنگ سے دیوار پر نشان
| ۱ فائرنگ سے فریدہ مجروح

۲- فائرنگ سے نشانے خطا کر گئے۔

اس طرح فائرنگ مجموعی ۵۶ آتی ہے (ان فائرنگ کے علاوہ کتنی خطا کردہ یا عمداً فائرنگ فضائے بسیط میں چلی گئی ہوں گی۔ انھیں اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی یہ تعداد حکومت کے بیان کردہ ۲۶ راؤنڈ سے کہیں زائد ہے (اگر ایک راؤنڈ سے مراد صرف ایک فائرنگ لی جاتی ہو) !! اس اندھادھند فائرنگ کے نتیجہ میں تقریباً ۴۵ منٹ میں کم از کم ۱۷ اموات واقع ہوئیں اور ۱۱ افراد مجروح ہوئے جن میں کئی کی حالت بڑی نازک ہو گئی۔ ہم ان لاپتہ افراد کی تعداد بھی چھوڑے دیتے ہیں جن کے ورثا پریشان حالی میں بدحواس ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان میں سے بھی کچھ اس اندھادھند فائرنگ کے شکار ہوئے ہوں؟ اس سے یہ نتیجہ لازماً نکلتا ہے کہ آفیشنل آرڈر صرف ۲۶ راؤنڈ کے لئے ملا ہو زائد راؤنڈ پولیس نے اپنے مطلب سے فائر کئے! (روزنامہ دعوت دہلی ۱۷ مارچ ۷۵ء)

پولیس فائرنگ پر مختلف بیانات

دعوت ۳ فروری ۷۵ء

"یہ افواہیں بھی سرگرم ہیں کہ پولیس کی بار بار فائرنگ سے بہت سے افراد ہلاک ہو گئے ہیں۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد بھی کافی بتائی گئی ہے ہنگامے کے دوران پولیس کی زیادتیوں کی بھی خبریں موصول ہوئی ہیں"

دعوت مورخہ ۴ فروری ۱۹۷۵ء

امیر جماعت اسلامی ہند نے کہا کہ "ایک معمولی واقعہ کو بنیاد بنا کر پولیس کی اندھادھند فائرنگ سے اتنے زیادہ افراد ہلاک اور زخمی ہوئے"

پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے مطابق: "پولیس نے ۲ فروری کو مختلف مقامات پر فائرنگ کرتے ہوئے ۲۶ گولیاں چلائیں اور آنسو گیس کے ۱۹ گولے چھوڑے"

"فائرنگ کے جو واقعات سامنے آئے ہیں ان کے کئی رخ تحقیقات کے محتاج رہیں۔ مثلاً یہ کہ فائرنگ کسی مجسٹریٹ کے حکم سے ہوئی یا پولیس نے اپنے

طور پر اقدام کیا۔ دوسرے جو گولیاں لوگوں کے سینے یا پیٹ میں لگی ہیں یہ بھی فائرنگ کے اصولوں کے مطابق ہوا ہے یا نہیں۔"

راجدھانی میں اس طرح کا حادثہ کوئی مذاق نہیں اور یہ باتیں عوام کے سامنے آنی چاہئیں کہ یہاں کے انتظامیہ اور پولیس میں حالات پر قابو پانے کی کتنی صلاحیت ہے۔"

"The Statesman" 4.2.75

"The Bhartiya Lokdal of the Samajvadi Yuvjan Sabha in separate statements on monday condemned the use of force by police on sunday in connection with Jama masjid clashes in which 9 people died, They demanded impartial enquiry into the incidents" 2

The "Statesman" 5.2.75

"Mr. Kanwarlal Gupta, Vice president of the Delhi Jansangh on Tuesday demanded Judicial enquiry into the Jama masjid Riots.- He told the Reporters that the police used "EXCESSIVE FORCE to control the situation. He charged the police with looting and threating innocents citizens."

(دعوت، مورخہ ۶ فروری ۱۹۷۵ء)

خصوصی اداریہ میں "حال ہی میں دلی کے اندر جو کچھ ہوا اور پولیس کی زیادتیاں سامنے آئیں ان کے کچھ واقعات ہم اپنے کالموں میں شائع کر رہے ہیں اور ہم یہ چاہتے

ہیں کہ ان پر سرسری طور سے نہ گذر جایا جائے بلکہ یہ سمجھ کر ملک کے دارالسلطنت کے مہذب علاقے میں دن دہاڑے جب یہ حرکتیں ہو سکتی ہیں تو دوسری جگہوں پر نہ جانے کیا کیا ہونا ہو گا۔ ۔۔"

(الجمعیتہ مورخہ ۷ رفروری ۷۵ء)

نئی دہلی ۵ رفروری:۔ مولانا سید احمد ہاشمی ایم ۔پی۔ ناظم عمومی جمعیتہ علمائے ہند نے آج لیفٹننٹ گورنر اور آئی۔جی پولیس سے ملاقاتیں کیں۔ آپ نے پولیس کی طرف سے اندھا دھند گرفتاریوں پر پولیس کے جابرانہ رویہ پر سخت احتجاج کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ تمام بے گناہ گرفتار شدگان کو فوراً رہا کیا جائے ایسے بیسیوں واقعات علم میں آئے ہیں کہ پولیس نے اپنی حدود سے تجاوز کر کے بے گناہ لوگوں کو دار وگیر کا نشانہ بنایا ہے۔ پولیس کی ان حرکتوں پر آپ نے تشویش ظاہر کی، ذمہ داروں پر زور دیا کہ ایسے تمام واقعات کو سختی سے روکا جائے اور ذمہ دار پولیس والوں کو سرزنش کی جائے۔ لیفٹننٹ گورنر اور آئی۔جی نے بڑی توجہ سے مولانا کی باتیں سنیں اور تمام مناسب کارروائیوں کا یقین دلایا۔"

(الجمعیتہ مورخہ ۸ رفروری ۷۵ء کا اداریہ)

"یہ مبالغہ نہیں کہ نظم وتربیت یافتہ سی۔ آر۔ پی، ایس۔ ایف نے مشتعل دسرپھرے نوجوانوں کی ایک بھیڑ کے مقابلہ میں جو رویہ اختیار کیا وہ بالکل ایسا تھا کہ گویا کسی دشمن ملک کی تسخیر کے لئے فوج کشی کی گئی ہے۔ اندھا دھند نہیں بلکہ تاک تاک کر گولیاں ماری گئیں۔ درجنوں اشخاص کو خاک میں خون میں تڑپا دیا گیا بے گناہ لوگوں کو اور گھروں کے اندر غیر مسلح ہو جانے والوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دینا بھی کیا قیام امن کیلئے ضروری تھا۔"

(الجمعیتہ مورخہ ۹ر فروری ۱۹۷۵ء)

" وزارت داخلہ کی مشاورتی کمیٹی میں مولانا اسحاق سنبھلی نے کہا کہ یہ بہت

افسوس ناک بات ہے کہ راجدھانی میں پولیس کی گولی سے دس افراد شہید ہوئے لاکھوں کی املاک کو نقصان پہنچا، سیکڑوں کی تعداد جیل میں ہے اور پرانی دلی کے مسلم علاقوں میں خوف وہراس ہے۔"

(دعوت مورخہ ۸ فروری ۱۹۷۵ء)

صدر مسلم لیگ کا بیان

دہلی ۷ر فروری ۔ کل انڈین یونین مسلم لیگ کے صدر مسٹر سلیمان سیٹھ نے اپنی پریس کانفرنس میں بتایا کہ انھوں نے جامع مسجد میں خون کے دھبے اور مسجد کے دروازے اور بیرونی دیواروں پر جو پولیس چوکی کے سامنے ہے گولیوں کے نشانات دیکھے۔ پولیس نے صرف چوکی کے باہر جمع ہونے والے ہجوم پر فائرنگ کی بلکہ پولیس چوکی سے مسجد کے اندر بھی گولیاں چلائیں مجھے بتایا گیا ہے کہ پولیس جامع مسجد کے دور دراز رہائشی علاقے میں بھی گھس کر عمارتوں کی دوسری اور تیسری منزلوں پر مردوں اور عورتوں پر گولیاں چلائیں۔ سیٹھ صاحب نے کہا ہے کہ مختلف جماعتوں کے لیڈروں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ پولیس کا اقدام ظالمانہ تھا۔

(دعوت، مورخہ ۱۱ر فروری ۱۹۷۵ء)

مراد آباد سے کمیونسٹ پارٹی کی ضلع کونسل نے پولیس کی زیادتیوں کی مذمت کی ہے۔ قائم مقام امیر جماعت اسلامی آندھرا پردیش: نظم ونسق نے طاقت کا بیجا استعمال کر کے نا اہلی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ گولی چلانا حد درجہ افسوسناک ہے۔ فائرنگ کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا۔

ناظم جالنہ (مہاراشٹر) نے جامع مسجد میں خطاب کرتے ہوئے اندھا دھند پولیس فائرنگ کی مذمت کی اور عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔

مسلمانان سہارنپور نے ایک جلسہ عام میں دہلی فائرنگ پر احتجاج کیا۔

(مارچ مورخہ ۱۵ر فروری ۱۹۷۵ء)

"حادثہ ٹالا جا سکتا تھا۔"

"زیادتیوں کی انتہا۔"

"عوام اپنے حق کے استعمال میں اگر تشدد سے کام لیں تو اسے روکنے کے لئے بہت سے طریقے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ گولیوں کا استعمال تو دشمنوں کے لئے ہونا چاہئے۔ ہندوستانی اس کا نشانہ کیوں بنے؟"

"قانون کے رکھوالوں نے عوام کو نشانہ بنانے تک محدود نہ رکھا۔ بلکہ پولیس بہت سے گھروں میں بھی گھس گئی۔ گھریلو قیمتی سامان لے گئی اور زیورات لے گئی۔"

"اگر فرض کر بھی لیا جائے کہ کچھ افراد نے پولیس پر گولیاں چلائیں تو سوال ہے کہ پولیس نے عوام سے اس کا انتقام کیوں لیا۔ ان افراد کو کیوں نہیں پکڑا جو گولیاں چلا رہے تھے؟"

(نئی دنیا مورخہ ۵ر مارچ ۱۹۷۵ء)

"وزیر داخلہ نے عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیوں رد کر دیا؟ شاید انھیں یہ ڈر ہے کہ اس طرح پولیس کے مظالم سامنے نہ آجائیں۔"

"ممبران پارلیمنٹ نے بحث کے دوران (۱۹ر فروری کو) جامع مسجد کے ہنگامے پولیس کے وحشیانہ سلوک اور حکومت کے قابل مذمت رویئے سے متعلق جو باتیں سامنے آئیں ان سے ہماری حکومت اور پولیس کے کردار کی وضاحت ہو گئی ہے۔"

جن سنگھ کے لیڈر مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے کہا کہ "بغیر ایک گولی چلائے صورت حال پر قابو پایا جا سکتا تھا۔"

"مسٹر جیوتر موئے باسو نے اقلیتی فرقے پر پولیس کے مظالم کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے اور فوری طور پر عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔"

"مسلم لیگ کے لیڈر مسٹر سلیمان سیٹھ نے "جامع مسجد کے فساد کا ذمہ دار پولیس کو قرار دیا" انھوں نے کہا کہ "اگر پولیس نے وحشیانہ سلوک کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا تو اتنا بڑا ہنگامہ کبھی نہ ہو پاتا۔"

"سی۔پی۔آئی کے مسٹر اسحاق انبھلی نے پولیس کے مظالم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے عدالتی کارروائی کا مطالبہ کیا۔"

پولیس نے اندھا دھند فائرنگ کر کے ایک درجن کے قریب بے گناہ انسانوں کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ یہ اپنی جگہ ایک بڑا ظلم اور پولیس کا ایک سیاہ کارنامہ تھا۔"

پولیس کو دوسرے لوگ بھی حق بجانب سمجھتے اگر وہ صرف ان لوگوں پر فائرنگ کرتی جو اس پر مبینہ طور پر پتھر پھینک رہے تھے ان پر گولی چلتی تو لاشیں پولیس چوکی کے سامنے ملتیں لیکن یہ بے گناہ انسان پولیس چوکی سے کئی فرلانگ دور خاک و خون میں تڑپتے نظر آئے ایک نوجوان فائر بریگیڈ اسٹیشن کے سامنے تڑپ رہا تھا جو پولیس چوکی سے بہت دور شاہی دروازے سے بھی آگے واقع ہے اور پھر اٹھارہ سالہ فریدہ کس پر پتھر پھینک رہی تھی کہ پولیس نے گھر میں گھس کر گولی چلائی ہے۔"

"ریلوے کے کسی حادثہ میں مرنیوالے کیلئے پچاس ہزار روپے اور پولیس کی گولی کا شکار ہونیوالے کیلئے صرف پانچ ہزار روپے، یہ فرق کیوں؟"

(الجمعیۃ مورخہ ۱۳ر فروری ۱۹۷۵ء)

میرٹھ ۱۱ر فروری۔ مسٹر منظور احمد ایم۔ایل۔اے نے آج ایک بیان میں ۱۰ر فروری کے واقعات پر انتہائی افسوس کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ انتہائی قابل مذمت پولیس کا رویہ ہے کہ اس نے علاقہ جامع مسجد میں اندھا دھند فائرنگ کی جس سے انگریز کے جابرانہ دور کی یاد تازہ ہو گئی۔ انھوں نے کہا کہ اس پولیس ایکشن کے بارہ میں جس میں نہتے مسلمانوں پر گولیاں برسائی گئیں اعلیٰ سطح پر انکوائری کرائی جائے اور ان افسران کے خلاف کارروائی کرائی جائے جو پولیس ایکشن کے ذمہ دار ہیں۔

(الجمعیۃ مورخہ ۵ر فروری ۱۹۷۵ء)

دلی ۲۰ فروری - آج صبح سرکاری طور پر اطلاع دی گئی ہے کہ گذشتہ روز جامع مسجد کے علاقہ میں ۴ مقامات پر پولیس نے فائرنگ کی تھی پولیس نے ۴ مقامات پر ۲۶ راؤنڈ گولی چلائی - یہ فائرنگ جامع مسجد - اردو بازار - چتلی قبر - اور جامع مسجد وچاوڑی کے کراسنگ پر ہوئی -"

جامع مسجد کے علاقہ میں ۴ مختلف مقامات پر عوام اور پولیس کا مقابلہ ہوا۔

ہوم گارڈ کے ایک افسر نے اخباری نمائندوں کو بتایا ہے کہ اس نے خود چار لاشیں اٹھائی ہیں - اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ دو لاشیں گلی گڑھیا - ایک لاش گوکل شاہ اور ایک لاش چھتہ میم صاحب میں پڑی تھیں۔

پارلیمنٹ میں ۱۹ر فروری ۱۹۷۵ء کو کامریڈ جیوتر موئے باسو نے تقریر کی کہ ہماری تحقیقات کے مطابق جامع مسجد کی دیوار پر ہی ۱۲ راؤنڈ کے نشانات موجود ہیں۔ فقیر محمد طالب علم جو پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہوا اس کے جسم پر ۷ گولیاں لگیں۔ یہ سب ۱۹ گولیاں ہوئیں اور اطلاعات کے مطابق ۲۲ سے ۲۵ افراد تک ہلاک ہوئے کم از کم ۲۲ افراد کی لاشیں مردہ گھر سے ملیں۔ اس لئے ہوم منسٹر کا بیان غلط ہے جھوٹا ہے کس طرح سات گولیاں ۲۲ سے لے کر ۲۵ افراد کو ہلاک کر سکتی ہیں اس معاملہ پر تحقیقات کی ضرورت ہے۔"

(روزنامہ دعوت ۲۰ مارچ ۷۵ء)

آہ! کہ ہم کھلونا بن گئے

ہمارے دس آدمی پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے، سو کے قریب زخمی ہو گئے اور ساڑھے پانچ سو آدمی گرفتار ہو گئے۔ ۲۵ دوکانیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئیں اور ہزاروں آدمی کرفیو کے باعث روزگار سے محروم اور نان خبینہ کو محتاج ہو گئے۔ ان سب گھروں میں کہرام مچا ہوا ہے لیکن سنگ دل سیاسی پارٹیاں اور بدطینت لیڈر اس انتہائی المناک

واقعہ کے نتائج سے بھی سستی سیاسی شہرت کمانے، لیڈری کی دوکان چمکانے، غم زدہ اور متاثرہ لوگوں کے جذبات سے کھیلنے میں مصروف ہیں۔ اس سے زیادہ شقاوت قلبی سیاسی لیڈروں کی پہلے کبھی نہیں دیکھنے میں آئی۔

آہ!...... یہ وقت تھا کہ لوگوں کی خدمت اور دلداری میں سب ہمہ تن مصروف ہوتے جو گولیوں کا نشانہ بنے تھے۔ ان کے لواحقین کی مدد کے لئے سب پارٹیاں کندھے سے کندھا ملا کر ایک ایسی رقم فراہم کرتیں کہ یہ خاندان اگر اپنے آدمیوں کا غم نہ بھولتے تو کم از کم ان کے بال بچوں کی تعلیم اور معاش سے تو بے فکری حاصل ہو سکتی۔ جو لوگ زخمی ہیں ان کے علاج معالجہ اور زخم بھرنے تک ان کی معاش کا بندوبست کیا جاتا۔ گرفتار شدگان کی رہائی کیلئے کوئی کارروائی ہوتی۔ لیکن یہ سب کچھ تو نہیں ہوا۔ بلکہ وہ تمام پارٹیاں اور لیڈر جو گذشتہ ایک سال کے دوران جامع مسجد کی صورت حال پر لب ہلانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے، وہ سب کائیں کائیں کرکے بولنے لگے اور بیانات جاری کرنے کیلئے وہ تمام لوگ بلوں سے نکل آئے جو اب تک دم بخود بیٹھے تھے یا درپردہ اس آگ کو ہوا دے رہے تھے جو اس علاقہ میں سلگائی جا رہی تھی۔ افسوس صد افسوس اس دور کا انسان کس بے دردی سے دوسرے انسانوں کے استحصال میں مصروف ہے کس طرح اپنے پڑوسیوں کا خون چوس رہا ہے اور کس بے شرمی سے ان کی مصیبتوں سے فائدہ اٹھا کر خود نمائی اور اخباروں کی سرخیوں کی زینت بننے میں مصروف ہے۔

ہم نے دیکھا اور خداوند شاہد عادل حاضر و ناظر اور عالم الغیب کو اس کا علم ہے اور وہی ان کو اجر عظیم عطا کرے گا جنھوں نے اس ایک ہفتہ کے دوران اپنی جان خطرہ میں ڈال کر لوگوں کو امن و سلامتی کا پیغام دیا، صبح سے اٹھ کر رات کے ۱۲ بجے تک ایک ٹانگ سے اپنے اس تاریخی شہر کے لوگوں کی فی سبیل اللہ خدمت میں مصروف رہے۔ لوگوں کیلئے راشن فراہم کیا، دودھ، ڈبل روٹی، مٹی کے تیل اور کوئلہ وغیرہ کا انتظام کیا جو لوگ کھانے وغیرہ کی اشیاء تیار کرا کے لائے اور بلا امتیاز مذہب و ملت

کرفیو کھلنے کے دوران تقسیم کرگئے۔ آخر الذکر طبقہ انسانی جذبہ سے معمور اور ایسے کاموں کا عادی ہے اور ایک ہاتھ سے دیتا ہے تو دوسرے کو خبر نہیں ہوتی اور اول الذکر طبقے میں وہ لوگ تھے جن کو پہلے بھی گالیاں دی جاتی تھیں، اس دوران بھی گالیاں دی گئیں اور کل بھی گالیاں دی جائیں گی، جنھیں ہندو کا غلام کہا جاتا ہے جنھیں سرکار کا ایجنٹ قرار دیا جاتا ہے جن کی بے لوث وبے یار خدمت کو کبھی خاطر میں نہیں لایا گیا جن کی ہوش مندانہ قیادت پر نہ صرف کبھی کان نہیں دھرا گیا اور اعتماد نہیں کیا گیا بلکہ جن کے ساتھ استہزا کیا گیا جن پر دست درازی کی کوشش کی گئی جن کے گریبانوں پر تمہارے گستاخ ہاتھ پہنچے

دلی کے مسلمانو! — نہیں، نہیں ہندوستان کے مسلمانو! خدا کے لئے سوچو تم کب تک اس سیاسی بازیگری کا شکار ہوگئے۔ کب تک تم ان گم کردہ راہ لیڈروں کی ڈگڈگی پر ناچتے رہوگے جو تمہارے مردار گوشت کی تجارت کرتے ہیں جو تمہاری لاشوں پر اپنی قیادت کے محل تعمیر کرتے ہیں۔ ہم کسی کا نام نہیں لیتے ہم کسی کی طرف انگلی اٹھا کر نشان دہی نہیں کرتے۔ اس لئے کہ تم عقل وخرد سے محروم نہیں ہو یہ اور بات ہے کہ تم ہوش کی بجائے جوش سے کام لیتے ہو! اور تدبیر کی راہ اختیار کرنے کی بجائے جذبات میں بہہ جاتے ہو!

اے فرزندانِ ملت سوچو! غور کرو یہ رہبر نہیں رہزن ہیں جو تمہارے جذبات سے کھیل رہے ہیں۔ آخر غور تو کرو کیا کسی نے جامع مسجد پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی، کسی نے خدا کے اس عظیم گھر کی بے حرمتی کی تھی حتی کہ اس گھرانے کو جسے تم نے اس وقت اپنی نادانی سے اپنی آرزوؤں اور ارمانوں کا واحد نشان اور علامت بنالیا ہے کوئی جامع مسجد کی امامت سے نہیں ہٹا رہا تھا! مسلم پرسنل لاء کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مسلم یونیورسٹی کے مستقبل کا بھی سوال نہیں تھا پھر تم پتھر لے کر بندوق بردار پولیس والوں سے آخر کیوں بھڑ گئے تم نے دس فرزندانِ توحید کو کیوں گولیوں کا نشانہ بنوا دیا ——۔

ذرا سوچو تم نے یہ عظیم قربانی دے کر اپنی ملت کو کیا عطا کیا یا اس کے لئے کیا حاصل کیا۔ تم کس کی عزت وحرمت کیلئے کٹ مرے۔

ہم سے نہ کہلواؤ، اپنے دل سے پوچھو، آج بھی تم ان رہزنوں کو رہبر سمجھ رہے

ہو جو اپنے اشتعال انگیز بیانات اور اخباروں کی جلی سرخیوں سے آپ کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ آخر کب ہوش کرو گے۔ کب جاگو گے ؟

جامع مسجد کے واقعات سے ملک بدنام ہوا ہے (وزیر اعظم)

واقعات کی مذمت اور اظہار افسوس، وزیر اعظم کے فنڈ سے امداد

نئی دہلی ۲۸ فروری۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے گذشتہ روز جامع مسجد دلی کے حالیہ واقعات کی شدت کے ساتھ مذمت کی اور کہا کہ انتظامی اور دوسرے طریقوں سے ہر ممکن کوشش اس بات کی ہونی چاہیئے کہ آئندہ اس قسم کے واقعات کا اعادہ نہ ہو۔ صدر کے ایڈریس پر بحث کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے ان واقعات پر گہرے افسوس کا اظہار کیا اور ان لوگوں سے اپنی ہمدردی ظاہر کی جن کو ان واقعات سے نقصان پہونچا جب اپوزیشن کے ایک ممبر نے مداخلت کرتے ہوئے پولیس کی زیادتی کا تذکرہ کیا تو وزیر اعظم نے کہا کہ اگر پولیس ذمہ دار ہے تو اس کی بھی مذمت ہونی چاہیئے۔ ذمہ دار خواہ کوئی ہو حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے واقعات سے ملک پر دھبہ آیا ہے۔ سوال اخلاقی رجحان کو اور جذبات کو اپنے لئے بہتر طور پر استعمال کرنے کا ہے۔

مسز گاندھی کمیونسٹ مارکسی ممبر مسٹر گوپالن کے اس الزام کا جواب دے رہی تھیں کہ مذہبی اقلیتوں کے حقوق کو پامال کیا جا رہا ہے مسز گاندھی نے کہا کہ مجھے یقین نہیں ہے

کہ جب مسٹر گوپالن نے یہ الزام لگایا تو وہ سنجیدہ تھے سوائے چند فرقہ پرستوں کے اگر لوگ ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر کسی چیز پر فخر کر سکتے ہیں تو یہی ہے ہندوستان میں انھیں یکساں حقوق حاصل ہیں اور ہندوستان کے سبھی مذاہب کے پیروؤں کو پوری مذہبی آزادی ہے،

دریں اثنا، مسز گاندھی نے وزیر اعظم کے ریلیف فنڈ سے جامع مسجد کے علاقے میں جانی نقصان اٹھانے والوں کی امداد کیلئے تیس ہزار پانچ سو روپے منظور کئے ہیں جن کنبوں کو جانی نقصان ہوا ہے ان کو ایک ایک ہزار اور جو زخمی ہوئے ہیں ان کو پانچ پانچ سو روپیہ دیا جائیگا زخمیوں کی تعداد ۴۳ ہے،

(منقول از:۔ الجمعیتہ ۲ر مارچ ۱۹۷۵ء)

عزیزم انور دلی کی کہانی کی ایک قسط میں نے تمہیں پوسٹ کردی ہے جو تمہیں مل چکی ہے دلی کی داستان دل گداز بھی ہے دراز بھی ہے کہانی تک کیا کیا باتیں لکھی جائیں۔

تنہا داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

بہرحال تمہارا کچھ خلوص تھا کہ دلی کی کہانی نوکِ قلم پر آ گئی ورنہ ارادہ تو تھا کہ خط کا مختصر سا جواب دوں لیکن نہ اس سے تم کو اطمینان ہوتا نہ مجھے ہی تسلی ہوتی۔ یہ کہانی قلم برداشتہ لکھی گئی ہے تاکہ آئندہ نسلیں بھی فائدہ اٹھائیں اور اس کہانی میں کسی سے ناانصافی نہیں کی گئی ہے ہر نکتہ و خیال کو پیش کیا گیا موافق و ناموافق تمام بیانات دے دیئے ہیں جو مستند ہیں۔ والسلام

عزیز الرحمٰن لدھیانوی

مولانا عزیز الرحمٰن

جامعی لدھیانوی ثم دہلوی

مقرّر — مؤلّف — مصنّف

- وحید الدین خاں ایڈیٹر سہ روزہ الجمعیتہ
- کوثر چاندپوری مشہور مصنّف
- ایڈیٹر تعلیم و ترقی جامعہ
- پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انور

ایم، اے، ایم، او، ایل، پی، ایچ، ڈی

آپ مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے فرزند ہیں۔ لدھیانہ آپ کا وطن ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد آپ کا خاندان بمشکل تمام لدھیانہ سے لاہور پہونچا۔ اپنے پیچھے ایک عظیم الشان مکان اور تمام اثاثہ چھوڑا اور دوست و احباب کو الوداع کہا۔ مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ ہندوؤں میں بھی آپ کے دوستوں کی کمی نہ تھی۔ مگر وقت پر کوئی ساتھ نہ دے سکا۔ کچھ دنوں مرحوم اپنے خاندان کے ہمراہ لاہور رہے۔ پھر وہاں سے دلی چلے آئے اور کوچہ رحمٰن چاندنی چوک میں اقامت کی ...... "

آج تک اس محلہ میں مقیم ہیں۔ مولانا عزیز الرحمٰن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ اپنے مرحوم والد کی طرح جوش اور ولولہ رکھتے ہیں، کئی کتابوں کے مؤلف اور مصنف بھی ہیں، اخبارات میں بھی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ حافظہ تیز ہے، جب بولتے ہیں تو مرحوم میں اور آپ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ہر بات جما کر اور پورا زور لگا کر کہتے ہیں۔ کسی خاص جماعت سے تعلق نہیں رکھتے ہیں، آزاد فکر کے مالک ہیں۔ اور مسائل حاضرہ پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ طبیعت میں استقامت ہے۔ جن جماعتوں کے ساتھ آپ کا اختلاف ہے۔ ان کے بارے میں کوئی لچک نہیں رکھتے، مرحوم والد کے نقشِ قدم پر چلنا باعثِ سعادت سمجھتے ہیں اسی لئے بہت سے نظریات اور خیالات آپ کو ورثہ میں ملے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ آزادی کے حافظ ہیں، خصوصًا مسلمان مجاہدین کے کارناموں سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور ان کے بارے میں ایک چارٹ بھی شائع کر چکے ہیں۔ جو بہت مقبول ہوا ہے۔

خیالات میں قدرے انتہا پسند ہیں، اعتدال پسندی سے طبیعت میل نہیں کھاتی، بحث و تکرار میں پوری مشق رکھتے ہیں۔ اور مخالف کو خاموش کر کے چھوڑتے ہیں۔ چونکہ مرحوم والد کے ہمراہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور پنڈت جواہر لال نہرو سے ملتے رہے ہیں۔ اس لئے ان کی باتیں مزے لے لیکر سناتے ہیں۔ کسی کے بارے میں

مولانا آزاد کی رائے بڑی صائب اور جچی تلی تھی۔ اس میں آپ بڑے نکات پیدا کرنے اور اس کو داد بھی دیتے ہیں۔ جن بعض اونچے لیڈروں کے حالات سناتے ہیں تو ان میں ندرت ہوتی ہے۔ چونکہ مذہبی اور سیاسی خیالات ورثہ میں پائے ہیں اس لئے ان کی روشنی میں مسائل حاضرہ کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کی صحت پہ اصرار کرتے ہیں مزاج اور عادات کے اعتبار سے بار خاطر معلوم نہیں دیتے، طبیعت میں خوشگواری اور مزاح ہے، بعض دفعہ زبان کے تیرو نشتر سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور کسی وقت تنقید حدِ اعتدال سے گذر جاتی ہے۔ خلیق اور ملنسار ہیں۔ ہر وقت متحرک رہتے ہیں۔ ہر حلقہ میں نشست و برخاست رکھتے ہیں اور کبھی کبھی دو فریقوں میں ٹکراؤ کا باعث بھی بنجاتے ہیں۔

ایک زمانہ میں آپ کمیونسٹوں سے بھی توقعات رکھتے تھے۔ مگر ان کے نظریات کو اپنانے سے قاصر رہے، مطالعہ شوق بھی ہے اور اخذ کرنے کا خداداد ملکہ بھی، وقتی مسائل پر جب استدلال کرتے ہیں۔ تو جرمنی کے نٹشے کو بھی پکڑ لاتے ہیں، اور کارلائل کی تحریروں سے بھی اپنے خیالات کو مدلل کرتے ہیں۔ بیشتر صحافت سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور نام کے بغیر کسی اخبار کے ادارتی فرائض بھی انجام دے لیتے ہیں۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے مداحوں میں ہیں۔ بلکہ ان کا اندازِ گفتگو بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ مجلس احرار کی یاد بھی تازہ رکھتے ہیں اور اس کے کارناموں کو سراہتے بھی ہیں۔ مجلس احرار کے ارکان اور لیڈروں کو ہر وقت جیب میں رکھتے ہیں غرض جس نے آپ کے والد مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے ملاقات کرنی ہو وہ آپ سے ملاقات کرلے۔ ایسا محسوس ہوگا کہ مرحوم آج بھی بقید حیات ہیں اور اپنی قادر الکلامی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

کام کا ایک میدان یہ گلی ہے

مولانا عزیز الرحمٰن جامعی کی تعلیمی اور سماجی خدمات

(از قلم:۔ وحید الدین خاں ایڈیٹر ہفتہ وار الجمعیۃ مورخہ ۲۷ جون ۱۹۶۹ء)

دلی میں بلیماران کے علاقہ میں ایک گلی ہے جس کا نام ہے "بارہ دری شیر افگن" مسلم محلہ کی تمام روایات سے بھرپور اس گلی سے آپ گذریں تو اس کی گندگی اور بے ترتیبی کے درمیان ایک خوبصورت بورڈ آپ کو اپنی طرف متوجہ کرے گا جس پر لکھا ہوا ہے "تعلیمی سماجی مرکز" اس خوبصورت بورڈ کے پیچھے ایک خوبصورت تر بلڈنگ میں وہ اسکول قائم ہے جس کا ہم اس وقت ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک نرسری اور پرائمری اسکول ہے جو پچھلے اٹھارہ سال سے کام کر رہا ہے اس کے بانی مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے صاحبزادے جناب عزیز الرحمٰن لدھیانوی جامعی ہیں۔

"۱۹۲۶ء میں لدھیانہ میں ایک عیسائی مشن قائم ہوا" عزیز الرحمٰن صاحب نے اپنی سرگذشت بیان کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ "یہ کلکتہ کے بعد ہندوستان کا دوسرا مشنری سنیٹر تھا۔ اس مشن کے تحت ایک بہت بڑا لیڈی ہاسٹل، ایک نرسری اسکول اور ایک ہائی اسکول تھے۔ عیسائی مشن کے اس قیام نے مسلمانوں کے اندر ہلچل پیدا کر دی چنانچہ اسی زمانہ میں میرے جد الجد مولانا شاہ عبد القادر صاحب دیہات سے لدھیانہ شہر منتقل ہوئے۔ اور مشن کے مقابلہ میں کام شروع کیا"

"لدھیانہ میں ہمارا مکان عیسائی مشن کے بالکل سامنے تھا اس کی سرگرمیوں کو دیکھ کر اور گھر کے تذکرے سن کر میرے اندر بھی بچپن ہی سے مشنری اسپرٹ پیدا ہوئی۔ اور میرے ذہن میں یہ خیال جم گیا۔ کہ میں بڑا ہو کر اسی قسم کا ایک اسکول قائم کروں گا۔

عزیز الرحمٰن صاحب جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے نان کوآپریشن تحریک شروع ہوئی تعلیم چھوڑ کر تحریک میں شامل ہو گئے۔ اور جیل گئے۔ جیل میں ہندو سیاسی

ورکروں کے ساتھ انھیں ایک عجیب تجربہ ہوا۔ مسلمان ورکر جو جیل میں تھے، ان کے گھر سے خطوط آنا شروع ہو گئے۔ کہ آپ کے جیل جانے کے بعد ہم سخت پریشانی میں۔ کوئی معاشی وسیلہ نہیں ہے۔ مگر ہندو ورکروں کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ وہ بالکل مطمئن تھے۔ انھوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ہر ایک کا کوئی نہ کوئی ایسا کام ہے جو اس کے بعد بھی اس کے گھر والوں کا سہارا بنا ہوا ہے۔ ان میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو اسکول اور پاٹھ شالہ چلاتے تھے۔ یہ ادارے اکثر ہندو سیاسی ورکروں نے اپنے بیوی بچوں کے نام پر قائم کر رکھے تھے۔ چنانچہ ان کے جیل جانے کے بعد بھی وہ ان کے گھر والوں کی روزی کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ اسی زمانہ میں گاندھی جی نے چرخہ سنگھ قائم کیا تھا جس کے تحت کھادی بھنڈار چلائے جا رہے تھے۔ اس کی شاخیں ہر شہر میں تھیں اور کانگریسی افراد اس میں کثرت سے ملازم ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی بد ذوقی کی وجہ سے چرخہ سنگھ میں بھی زیادہ تر ہندو کانگریسی تھے۔ ہندو کارکن جیل گیا تو اس کی بیوی اس کی جگہ ملازم ہو گئی۔

نان کو آپریشن میں تقریباً چھ لاکھ ہندوستانی جیل گئے جن میں دو لاکھ مسلمان تھے۔ مگر چرخہ سنگھ میں مسلمانوں کا تناسب بیحد کم تھا۔ اس کی وجہ سے ہندو ورکر جیل میں بھی مطمئن تھے۔ اس کے برعکس مسلم ورکر زیر پریشانی تھے۔

"اس وقت مجھے خیال آیا" عزیز الرحمٰن صاحب نے کہا" کہ اگر سیاسی کام کرنا ہے تب بھی سب سے پہلے معاشی انتظام کر لینا چاہیئے۔ انھوں نے نرسری اسکول قائم کرنا طے کیا۔ کیونکہ نرسری اسکول ہر ماں، باپ کی پہلی ضرورت ہے۔ نرسری اسکول چھوٹے بچوں کیلئے گویا ایک قسم کا تعلیمی گھر ہے۔ نرسری تعلیم کا بنیادی تخیّل یہ ہے کہ بچوں کے اندر کھیل کھیل میں تعلیمی شوق پیدا کر دیا جائے تاکہ جب وہ اسکول کی عمر کو پہنچے تو وہ عمدہ تعلیمی آغاز کے قابل ہو چکا ہو۔ اسکول کی عمر عام طور پر چھ سال سمجھی جاتی ہے اس سے پہلے چند سال تک بچوں کو نرسری میں پڑھایا جاتا ہے۔ نرسری میں استاد کی جگہ عام طور پر عورتوں کو رکھا جاتا ہے۔ تاکہ وہ چھوٹے بچوں کی ماں کا بدل بن سکیں۔

میرے یہاں جب تعطیلات کا اعلان ہوتا ہے تو بچوں کو خوشی کے بجائے مایوسی ہوتی ہے۔ عزیز الرحمٰن صاحب نے کہا کیونکہ یہاں سے جانے کے بعد انھیں ستانیوں کی شفقت یاد آتی ہیں۔ نرسری اسکول ڈھنگ سے چلایا جائے تو بچوں کے بارے میں تعلیمی بدشوقی کی شکایت ختم ہو جائے۔

• یونیسکو کی ایک رپورٹ کا ذکر نیڈت نہرو بار بار کہا کرتے تھے اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ۲ سال سے ۱۲ سال کی عمر تک ایک بچہ سات زبانیں سکھائی جا سکتی ہیں۔ پختگی والی عمر کو پہنچنے کے بعد رجحان طبع کو تقسیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ابتدائی عمر میں بچے کے اندر کوئی اپنا طبعی رجحان نہیں ہوتا اس لئے اس کو کئی زبانوں کی تعلیم بیک وقت دی جا سکتی ہے کسی قوم میں تعلیمی معیار کو عام اور اونچا کرنے کیلئے نرسری تعلیم کا انتظام ضروری ہے اس سے اندازہ کیجئے کہ جس قوم میں ابتدائی عمر میں نرسری تعلیم کا انتظام نہیں ہے وہ کتنے بڑے نقصان سے دوچار ہے

یہ کام ہندوستان میں ابتک زیادہ تر عیسائی مشنریوں کی اجارہ داری رہا ہے ایک اعداد و شمار کے مطابق عیسائی تعلیم گاہوں میں نرسری سے کالج تک ۲۲ لاکھ ہندوستانی بچے تعلیم پا رہے ہیں یہ سب اچھے خاندانوں کے بچے ہیں۔ کیونکہ عیسائی تعلیم گاہوں کے اخراجات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ عام آدمی ان کو برداشت نہیں کر سکتا انگلش میڈیم ہونے کی وجہ سے اور تعلیم کا معیار بلند ہونے کی وجہ سے یہی طلبا زیادہ تر بیرونی اسکالرشپ حاصل کریں گے۔ اور بالآخر یہی وہ لوگ ہیں جو ملک کا ایڈمنسٹریشن سنبھالیں گے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو یہ کام جو بظاہر تعلیمی کام ہے، اپنے اندر زبردست سیاسی امکانات رکھتا ہے۔

عزیز الرحمٰن صاحب نے ۱۹۵۰ء میں جب کام شروع کیا تو ان کے پاس بلڈنگ تھی نہ اور سرمایہ۔ "وہ میدانی اسکول" اور "دیوار کی مطالعہ" چلاتے اور میونسپلٹی کے کھمبے کی روشنی میں لڑکوں کو خود پڑھاتے۔ بالآخر ان کی محنت کارگر ہوئی۔ اور آج وہ ایک اعلیٰ درجہ کا نرسری اسکول اور ایک پرائمری اسکول چلا رہے ہیں۔ طلباء کی مجموعی تعداد ساڑھے

ورکروں کے ساتھ انھیں ایک عجیب تجربہ ہوا۔ مسلمان ورکر جو جیل میں تھے، ان کے گھر سے خطوط آنا شروع ہو گئے۔ کہ آپ کے جیل جانے کے بعد ہم سخت پریشانی ہیں۔ کوئی معاشی وسیلہ نہیں ہے۔ مگر ہندو ورکروں کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ وہ بالکل مطمئن تھے۔ انھوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ہر ایک کا کوئی نہ کوئی ایسا کام ہے جو اس کے بعد بھی اس کے گھر والوں کا سہارا بنا ہوا ہے۔ ان میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو اسکول اور پاٹھ شالہ چلاتے تھے۔ یہ ادارے اکثر ہندو سیاسی ورکروں نے اپنے بیوی بچوں کے نام پر قائم کر رکھے تھے۔ چنانچہ ان کے جیل جانے کے بعد بھی وہ ان کے گھر والوں کی روزی کا ذریعہ بنے ہوئے تھے۔ اسی زمانہ میں گاندھی جی نے چرخہ سنگھ قائم کیا تھا۔ جس کے تحت کھادی بھنڈار چلائے جا رہے تھے۔ اس کی شاخیں ہر شہر میں تھیں اور کانگریسی افراد اس میں کثرت سے ملازم ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی بد ذوقی کی وجہ سے چرخہ سنگھ میں بھی زیادہ تر ہندو کانگریسی تھے۔ ہندو کارکن جیل گیا تو اس کی بیوی اس کی جگہ ملازم ہو گئی۔

نان کوآپریشن میں تقریباً چھ لاکھ ہندوستانی جیل گئے جن میں دو لاکھ مسلمان تھے۔ مگر چرخہ سنگھ میں مسلمانوں کا تناسب بیحد کم تھا۔ اس کی وجہ سے ہندو ورکر جیل میں بھی مطمئن تھے۔ اس کے برعکس مسلم ورکر زیر پریشانی تھے۔

"اس وقت مجھے خیال آیا" عزیز الرحمٰن صاحب نے کہا" کہ اگر سیاسی کام کرنا ہے تب بھی سب سے پہلے معاشی انتظام کر لینا چاہیئے۔ انھوں نے نرسری اسکول قائم کرنا طے کیا۔ کیونکہ نرسری اسکول ہر ماں، باپ کی پہلی ضرورت ہے۔ نرسری اسکول چھوٹے بچوں کیلئے گویا ایک قسم کا تعلیمی گھر ہے۔ نرسری تعلیم کا بنیادی تخیّل یہ ہے کہ بچوں کے اندر کھیل کھیل میں تعلیمی شوق پیدا کر دیا جائے تاکہ جب وہ اسکول کی عمر کو پہنچے تو وہ عمدہ تعلیمی آغاز کے قابل ہو چکا ہو۔ اسکول کی عمر عام طور پر چھ سال سمجھی جاتی ہے اس سے پہلے چند سال تک بچوں کو نرسری میں پڑھایا جاتا ہے۔ نرسری میں استاد کی جگہ عام طور پر عورتوں کو رکھا جاتا ہے۔ تاکہ وہ چھوٹے بچوں کی ماں کا بدل بن سکیں۔

میرے یہاں جب تعطیلات کا اعلان ہوتا ہے تو بچوں کو خوشی کے بجائے مایوسی ہوتی ہے۔ عزیز الرحمٰن صاحب نے کہا کیونکہ یہاں سے جانے کے بعد انھیں استانیوں کی شفیق یاد آتی ہیں۔ نرسری اسکول ڈھنگ سے چلایا جائے تو بچوں کے بارے میں تعلیمی بدشوقی کی شکایت ختم ہوجائے۔

یونیسکو کی ایک رپورٹ کا ذکر پنڈت نہرو بار بار کہا کرتے تھے اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ۳ سال سے ۱۲ سال کی عمر تک ایک بچہ سات زبانیں سکھائی جا سکتی ہیں۔ پختگی والی عمر کو پہنچنے کے بعد رجحان طبع کو تقسیم کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

ابتدائی عمر میں بچے کے اندر کوئی اپنا طبعی رجحان نہیں ہوتا اس لئے اس کو کئی زبانوں کی تعلیم بیک وقت دی جا سکتی ہے کسی قوم میں تعلیمی معیار کو عام اور اونچا کرنے کیلئے نرسری تعلیم کا انتظام ضروری ہے اس سے اندازہ کیجئے کہ جس قوم میں ابتدائی عمر میں نرسری تعلیم کا انتظام نہیں ہے وہ کتنے بڑے نقصان سے دوچار ہے

یہ کام ہندوستان میں ابتک زیادہ تر عیسائی مشنریوں کی اجارہ داری رہا ہے ایک اعداد و شمار کے مطابق عیسائی تعلیم گاہوں میں نرسری سے کالج تک ۲۲ لاکھ ہندوستانی بچے تعلیم پا رہے ہیں یہ سب اونچے خاندانوں کے بچے ہیں۔ کیونکہ عیسائی تعلیم گاہوں کے اخراجات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ عام آدمی ان کو برداشت نہیں کرسکتا انگلش میڈیم ہونے کی وجہ سے اور تعلیم کا معیار بلند ہونے کی وجہ سے یہی طلبا زیادہ تر بیرونی اسکالرشپ حاصل کریں گے۔ اور بالآخر یہی وہ لوگ ہیں جو ملک کا ایڈمنسٹریشن سنبھالیں گے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو یہ کام جو بظاہر تعلیمی کام ہے، اپنے اندر زبردست سیاسی امکانات رکھتا ہے۔

عزیز الرحمٰن صاحب نے ۱۹۵۰ء میں جب کام شروع کیا تو ان کے پاس بلڈنگ تھی نہ اور سرمایہ۔ "وہ میدانی اسکول" اور "دیواری مطالعہ" چلاتے اور میونسپلٹی کے کھمبے کی روشنی میں لڑکوں کو خود پڑھاتے۔ بالآخر ان کی محنت کارگر ہوئی۔ اور آج وہ ایک اعلیٰ درجہ کا نرسری اسکول اور ایک پرائمری اسکول چلا رہے ہیں۔ طلباء کی مجموعی تعداد اسٹھ ہے

تین سو ہے اور ٹیچر تیرہ ہیں۔ انھیں گورنمنٹ سے کوئی امداد نہیں ملتی۔ انتہائی کوشش کے باوجود یہاں ناکام رہے۔ ان کا ذریعہ آمدنی اول وہ فیس ہے جو طلباء سے حاصل ہوتی ہے۔ اسکول کے رکشے سے ڈھائی سو روپے مہینے کی آمدنی ہوجاتی ہے۔ پچھلے سال سے انھوں نے "بچوں کی دوکان" شروع کی ہے۔ اس کے ذریعہ سے اسٹیشنری یا کھانے پینے کی خشک چیزیں اور کتابیں بچوں کو فراہم کی جاتی ہیں۔ اس شعبے نے ایک سال میں ایک ہزار روپے کا نفع دیا۔ "اگر ہمیں گرانٹ مل بھی جائے" عزیز الرحمٰن صاحب نے کہا "تو ایڈہاک گرانٹ کی صورت میں دو ہزار سالانہ سے زیادہ نہیں ملیں گے۔ جبکہ ہم ٹرانسپورٹ سے ڈھائی ہزار روپے سال کما لیتے ہیں۔"

میں عزیز الرحمٰن صاحب سے اپنی ملاقات ختم کرکے باہر نکلا تو سڑک پر مسلمان بچے گندے کپڑوں میں ملبوس کھیل میں مشغول تھے، مسلمان دوکاندار اور مسلمان راہ گیر کی شکلوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ زمانہ کی تعلیم میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے دنیا میں اپنے لئے قرار واقعی جگہ نہ بنا سکے۔ ایک جگہ اس پولیس افسر مسلمان دوکاندار سے تحقیر آمیز گفتگو کر رہا تھا۔ میں ان مناظر سے گذر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مسلمان کی قوم بھی کتنی بے شعور ہے۔ عیسائی مسلمانوں سے چھوٹی اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انکی ملک میں کوئی سیاسی پارٹی بھی نہیں۔ مگر ایک بنیادی چیز۔ ابتدائی اسکول۔ پر قبضہ کرکے انھوں نے گویا پورے ملک کے دل و دماغ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ انکی حکومت ختم ہوگئی مگر ان کے حقوق آج بھی پوری طرح محفوظ ہیں کیونکہ وہ تعلیم یافتہ ہونیکی وجہ سے باشعور ہیں وہ اعلیٰ تعلیمی لیاقت کی بدولت زمانہ سے اپنا بھرپور حق وصول کر رہے ہیں۔ ملک کے رہنما اور حکمراں طبقہ کی بڑی تعداد ان کے اسکولوں کی تعلیم یافتہ ہونیکی وجہ سے طبعی طور پر ان کے ساتھ ہمدردی کے جذبات رکھتی ہے۔

عزیز الرحمٰن جامعی نے اس معاملہ میں پڑوسی اقلیت کے طریقہ کو اپنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مگر ہمارے درمیان ایسے لوگ کتنے ہیں۔ ابھی قوم کو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں عزیز الرحمٰن جامعی کی ضرورت ہے اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ قومی سطح پر ہم کو وہ فوائد حاصل ہوسکیں جس کے دوسرے لوگ مالک بنے ہوئے ہیں۔

عزیز لدھیانوی جامعی

مشک آں باشد کہ خود بگوید نہ کہ عطار بگوید

(از قلم: کوثر چاندپوری مشہور ادیب و مشہور طبیب ہمدرد دواخانہ دہلی دسمبر ۱۹۵۶ء)

عزیز صاحب لدھیانوی (پنجاب) کے ایک مشہور علمی روحانی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ وہ مئی ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے فارسی اور عربی کی تعلیم دارالعلوم دیوبند اور جامعہ صولتیہ مکہ میں حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء میں مکہ سے مراجعت کی۔ چند روز بعد ہی جدید علوم کی تحصیل کیلئے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء تک تعلیم پاتے رہے — ۱۹۳۶ء میں انھوں نے سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ ۱۹۳۹ء میں بغاوت کا الزام عائد ہوا۔ جس کے نتیجے میں دو سال تک نظربند رہے۔ ۱۹۴۵ء میں روزنامہ آزاد لاہور کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

عزیز صاحب کو ذہنی و دماغی صلاحیتیں ورثہ میں ملی ہیں جو ان کی "خلقت" عزم بیباکی اور حریت فکر و رائے کے عناصر سے ہوئی ہے۔ انھیں چیزوں سے ان کا وہ اسلوب نگارش ابھرتا ہے جو ایک خاص قسم کی انفرادیت دلکشی برجستگی اور شگفتگی سے عبارت ہے سیاسی معاملات میں گرمئ تحریر کے وہ جوہر نمایاں ہیں جن سے وسعتِ نگاہ اور مطالعہ کی گہرائی کا اظہار ہوتا ہے انھیں آج کی زندگی اور اس کے مسائل سے بڑی دلچسپی ہے۔ عزیز صاحب ایک تعلیمی ادارہ بھی نہایت کامیابی سے چلا رہے ہیں۔

مولانا عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی

متعلیم و ترقی کا ایک فرد

(از: ایڈیٹر تعلیم و ترقی جامعہ فروری ۱۹۵۲ء)

میں لدھیانہ (پنجاب) کے ایک ایسے خاندان میں (۱۹۱۹ء میں) پیدا ہوا جسے حکومت پنجاب کی فہرست میں "۱۸۵۷ء کا باغی خاندان" کا لقب دیا گیا تھا۔ میں جب پانچ سال کا تھا اسوقت خلافت کی تحریک بڑے زور پر تھی۔ والد صاحب (مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی) جیل جاچکے تھے اور ہمارے گھر کا مال و اسباب سڑک پر لاکر نیلام کیا جارہا تھا۔ یہ تھا وہ ماحول جس کی گود میں میں نے آنکھ کھولی۔

خلافت کا دور گذر گیا اور والد صاحب جیل سے باہر تشریف لائے تو میری تعلیم کی فکر ہوئی۔ اور انھوں نے میرے لئے دیوبند کا مدرسہ (دار العلوم) منتخب کیا۔ دیوبند میں ایک ہی سال رہنے پایا تھا کہ مکہ شریف میں میری تعلیم کا انتظام ہوگیا اور مجھے وہاں بھیج دیا گیا۔ مگر وہاں بھی دو ہی سال رہنے کا موقعہ ملا۔ دو سال کے بعد جب میں وطن واپس آیا تو یہاں پھر سیاسی جد و جہد شروع ہو گئی تھی۔ اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد والد صاحب پھر جیل چلے گئے۔ جیل میں اتفاق سے والد صاحب اور ڈاکٹر انصاری مرحوم ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ وہیں ڈاکٹر صاحب نے والد صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ مجھے جامعہ ملیہ میں بھیج دیں چنانچہ میں ۱۹۲۹ء میں جامعہ میں داخل ہوا۔

جامعہ میں میں نے ۱۹۳۵ء تک تعلیم حاصل کی مگر اس زمانے کی سیاسی جد و جہد نے مجھے جامعہ سے نکال کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور اسوقت سے ۱۹۴۸ء تک میں نے مختلف تحریکوں میں کام کیا۔ کئی بار جیل گیا، کبھی مزدوروں میں کام کیا تو کبھی انتخابی جنگ میں۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی آزادی کی منزل سامنے آگئی۔ اور ملک کی تقسیم کے سلسلے میں میرے عزیز رشتے دار تو پاکستان چلے گئے مگر والد صاحب اور ان کا پورا خاندان اپنا آبائی وطن چھوڑ کر دہلی چلا آیا۔ دہلی میں ۱۹۴۸ء میں بالغوں کی تعلیم کے سلسلے میں تعلیمی مرکزوں کی تحریک جاری

تھی۔ میں نے اس تحریک کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اب جبکہ ملک کی سیاسی جنگ ختم ہو چکی ہے، ضرورت ہے کہ اس کی تعمیر نو کا پروگرام شروع کیا جائے۔ چنانچہ اسی مقصد کیلئے میں جامعہ کے شعبۂ "تعلیم بالغان" ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ" کے حلقے میں شامل ہو گیا۔ اور اس کے ایک تعلیمی مرکز کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔

تعلیمی مرکزوں کے راستے میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ بنتی ہے وہ بستی کے پرانے سماجی ادارے اور وہ روایات ہیں جن کے یہ ادارے حامل ہوتے ہیں۔ پہلے پہل تو وہ تعلیمی مرکز کو اچنبھے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ مگر آہستہ آہستہ جب انھیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس مرکز کی بدولت پسماندہ طبقے کو ابھرنے کا موقع مل رہا ہے۔ اور سماجی زندگی کا پرانا ڈھانچہ کمزور ہو رہا ہے۔ تو وہ خائف ہونے لگتے ہیں۔ اور اس خوف کا نتیجہ مرکز کے خلاف طرح طرح کی سازشوں میں نکلتا ہے۔ اس ذیل میں مجھے جن باتوں کا احساس ہوا۔ انھیں مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) امیر طبقہ پسماندہ طبقے کی ترقی اور بیداری سے جلنے لگتا ہے۔

(۲) اونچی نسلوں اور خاندانوں کے لوگ پسماندہ طبقے پر ہر قیمت پر اپنی فوقیت قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

(۳) سیاسی غرض کے لوگ مرکز کو پردے ہی پردے میں اپنی سیاسی اغراض کیلئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اور جب اس مہم میں ان کو ناکامی ہوتی ہے تو مرکز کے خلاف اپنے سیاسی ڈھنگ پر پروپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں۔

میں نے اپنے چار سال کے تجربے میں نہ صرف ان مشکلات کو سمجھا ہے بلکہ ان کے مقابلہ کر کے مرکز کو چلایا ہے۔ یہ تو ضرور ہوا ہے کہ بستی کے کچھ لوگ مرکز اور اس کے کارکنوں سے ناراض ہو گئے ہیں۔ مگر بہ حیثیت مجموعی بستی کی عام جنتا مرکز کی تحریک کی بدولت گھل مل کر ایک جان ہو گئی ہے اور میری رائے میں کسی مرکز کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ بستی کے خصوصاً پسماندہ طبقوں کے لوگ گھل مل کر ایک جگہ جمع ہونے لگیں۔ اور اپنی مشکلات اور مسائل پر خود قابو حاصل کرنے کے عادی ہو جائیں۔ ہمارے مرکز میں کام شروع کرنے

کے بعد حالات کا جائزہ لیا اور اسکی روشنی میں اپنے لئے کام کا جو خاکہ ترتیب دیا اسکا ذکر اپنی سالانہ رپورٹ میں ان الفاظ میں کیا تھا۔

"بستی کے مرکز کو لوگ عام طور پر مدرسہ سمجھتے تھے۔ اور اس غلط فہمی کیوجہ سے کام میں بڑی رکاوٹ پڑتی تھی۔ میں نے اپنے لئے پہلا کام یہ تجویز کیا کہ بستی کے باشندوں کے دل و دماغ سے یہ غلط فہمی دور کر دینی چاہیئے۔ اور ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دینی چاہیئے کہ "تعلیمی مرکز" کوئی مدرسہ نہیں ہے بلکہ یہ بالغوں کی تعلیم، بچوں کی غیر نصابی تربیت، والدین کی تربیت وغیرہ کا مرکز ہے۔ جس کے ذریعہ ایک اچھے سماج کی تشکیل و تعمیر مقصود ہے"،

ان مقصد کے ماتحت کام کلیم نے ڈھنگ بنایا تھا، جو حسب ذیل ہے،

(۱) روزانہ کی خبریں اور ان کا واقعاتی پس منظر سمجھانے کے لئے ایک فارم (۲) دیواری اخبار لگانا (۳) دارالمطالعہ (۴) خواندگی اور خواندگی کے بعد آگے کی تعلیم کے درسی حلقے (۵) بزم ادب۔ جس کے ماتحت بستی کے لکھنے پڑھنے والے لوگ اور شاعر ادبی جلسے کرتے تھے۔ (۶) انجمن خواتین۔ جس کے ماتحت عورتوں میں تعلیم حاصل کرنے، گھروں کو آراستہ رکھنے اور زنانہ دستکاریاں۔ (۷) نوجوان کلب۔ اس کلب میں بستی کے نوجوان آتے تھے۔ اور کھیلوں میں حصہ لینے کے علاوہ مرکز کے عام کاموں اور سرگرمیوں کی تنظیم میں وارڈن کے ساتھ کام کرتے تھے۔ (۸) بچوں کا کلب۔ اس کلب کے ماتحت فرصت کے اوقات میں بچوں کو جمع کیا جاتا تھا۔ اور ان کیلئے جلسوں، سیروں، پکنک اور دوسری غیر نصابی سرگرمیوں کا اہتمام ہوتا تھا۔ یہ تو مرکز کے مستقل شعبے تھے۔ انکے علاوہ وقتی طور پر اپنے مقامی مسائل کو حل کرنے اور بعض معاملات پر سوچ بچار کرنے، مل جل کر کھانے پینے اور سیر سپاٹے کرنے کی غرض سے ایک "انجمن احباب" (Friends association) اور ایک "انجمن اہل محلہ" (Community Council) بھی قائم تھی۔ مرکز کے ابتدائی دور میں سخت مالی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر لوگوں کو شروع ہی سے اس چیز کا عادی بنا لیا جائے۔ کہ انھیں مرکز سے فائدہ اٹھانے کیلئے اس کی ہر جماعت کا ممبر بننا ہوگا۔ اور فیس رکنیت ادا کرنی ہوگی۔ تو مالی مسئلہ بھی بہت حد تک حل ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس نقشے سے ہوگا جو بستی سے حاصل ہونے آمدنی کے سلسلے

میں میں نے ترتیب دیا تھا۔

سنہ ۱۹۴۹ء میں	بستی سے	تقریباً	۱۲۰۰/	روپے حاصل ہوئے
سنہ ۱۹۵۰ء میں	"	"	۲۵۰۰/	"
سنہ ۱۹۵۱ء میں	"	"	۴۰۰۰/	"

یہ کامیابی تو اس صورت میں ہوئی جب بستی کا مالدار طبقہ مرکز کے خلاف تھا اور اس کی کوئی مدد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ان اعداد میں بڑا حصہ ان رقموں کا ہے جو ہم ماہوار دینے والوں نے چندے کے طور پر ادا کیا۔

ہمارے مرکز کی ان سرگرمیوں کی کامیابی کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ آس پاس کی جن بستیوں میں مرکز کی پہنچ نہیں ہو سکتی تھی۔ انھوں نے خود چھوٹے بڑے پیمانے پر اپنے اپنے یہاں تعلیمی پروگرام چلائے۔ مثلاً مرکز کے دیواری اخبار کی نقل میں انھوں نے بھی دیواری اخبار شائع کرنے شروع کئے، خواندگی وغیرہ کے درسی حلقوں کے نمونے پر شبینہ کلاسیں قائم کیں، بچوں اور نوجوانوں نے مرکز کے کتب خانے کے ڈھنگ پر پرانی اور چھوٹی کتابیں جمع کر کے کتب خانے قائم کئے اور پھر یہ بنوا بنوا کر کتابیں جاری کرنے اور واپس لینے کے طریقے اختیار کئے۔ مختصر یہ کہ سنہ ۱۹۴۹ء کے مقابلے میں جبکہ علاقے میں چھوٹے پیمانے پر قائم ہونے والا ایک بھی تعلیمی ادارہ نہیں تھا۔ اب چار سال کے بعد وہاں چھوٹے بڑے ۲۰ تعلیمی ادارے قائم ہیں، جو رات کے وقت بالغوں، بچوں اور نوجوانوں کیلئے کھلتے ہیں۔

اور میری رائے میں تعلیمی مرکز کے فیض و اثر سے اگر علاقے کے اندر اپنی مدد آپ کے اصول پر اس طرح کی تعلیمی سرگرمیوں کی بنیاد پڑ جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے:۔

مولانا عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی

تعارف از قلم:۔ پروفیسر ڈاکٹر منوہر سہائے انور ایم اے ایم او ایل پی ایچ ڈی

مولانا عزیز الرحمٰن جامعی خلف الرشید رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی خود بھی اپنے والد ماجد کی طرح تفکر اور ابلاغ میں مجتہدانہ انفرادیت کی خداداد نعمت سے

بدرجۂ غایت بہرہ اندوز ہو کر شمع انجمن افروز بن گئے ہیں۔ آپ قوم پرست مسلم مکتبِ خیال کی صحیح ترجمانی، تاریخی واقعات کی بازآفرینی اور سیاسی و معاشرتی معاملات کی جائزہ گیری میں ید طولےٰ رکھنے کے ساتھ ہی اپنے قلم فصاحت رقم سے ایسی گل افشانیاں کرتے ہیں۔ کہ ارباب نظر محظوظ و مسرور ہو کر سبحان اللہ کہنے لگتے ہیں ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست ✽ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

میں نے آپ کی متعدد تصانیف مثلاً رئیس الاحرار، مسائل امروز، مکساں سول کوڈ، (مطبوعہ) اور جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین (چار جلد) جمہوری ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا خطرے میں ہے (غیر مطبوعہ) بڑی توجہ اور گہری دلچسپی سے پڑھی ہیں۔ اور ان میں حقائق کی جمع آوری۔

آپکو خداوند کریم نے حق بینی، حق نیوشی، حق اندیشی اور حق شعاری ودیعت کی ہے۔ آپ کے وطن پرست دل و دماغ میں فرقہ وارانہ تعصب اور بے جا جانبداری کا دخل کبھی نہیں ہوا۔ آپ مسلموں اور غیر مسلموں کی آزادئ فکر و عمل، اقتصادی فلاح و بہبود اور متمدانہ معاشرت کے نہایت پُرجوش حامی اور انتھک مبلغ ہیں۔ اور آپکی تحریر انہیں مقاصد کی تبلیغ و خدمت کے لئے وقف رہتی ہیں۔ ع **آفریں باد بریں ہمت مردانۂ تو**

زیر نظر کتاب آپکی تازہ ترین تصنیف ہے جسمیں آپنے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر کی روحانی ہدایت، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی سیاسی قیادت، حکیم الملک حکیم عبدالحمید کی طبی عظمت، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی اور سیاسی منزلت مولانا عبدالباقی کی صحافتی بصیرت، ڈاکٹر ایس۔ ایس۔ کول کی اولوالعزمی اور استقامت کی خیال افروز داستانیں لطیف پیرائے میں بیان کرنے کے بعد ایک ایک باب محمد علی کلے، ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ، لارڈ برٹرینڈرسل اور مولانا حفظ الرحمٰن کے حالات و معتقدات پر لکھا ہے،

یہ کتاب کیا بلحاظ نفسِ مضمون اور کیا باعتبارِ اندازِ تحریر اس قابل ہے کہ اسے بار بار پڑھکر ان عقائد اور ان سے پیدا ہونیوالے محرکات کو ذہن نشین رکھا جائے جنکی بدولت متذکرہ بالا ہستیوں کو عظیم الشان ہونیکا شرف حاصل ہوا۔

مجھے یقین کامل ہے کہ یہ کتاب بھی مولانا عزیز الرحمٰن کی سابق تصنیفات کیطرح مسلموں اور غیر مسلموں میں یکساں مقبول ہو گی۔ جس سے آپکی ملک گیر مبصرانہ اور مصنفانہ شہرت میں اور بھی اضافہ ہو گا



مولانا عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی ثم دہلوی کتاب کی تصنیف میں مصروف

عطا اسلاف کا سوزِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لَا یَحْزَنُوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

غالبؔ کی پریشانیاں اور ۱۸۵۷ء کا المیہ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

۹؍ جون ۱۸۶۶ء